Registered No. L. 4186

ذی القعدۃ ۱۳۵۷ھ — جلد ۱۳—عدد ۵

۷۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دار الاسلام (پٹھان کوٹ - پنجاب)

قیمت سالانہ پانچ روپے — قیمت فی پرچہ ۸ آنے

مدیر ترجمان القرآن کی تالیفات

الجہاد فی الاسلام مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے:-

۱- اسلامی جہاد کی حقیقت ۔ اسمیں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظام تمدن میں روحِ جہاد کا کیا مرتبہ ہے

۲- مدافعانہ جنگ ۔ وہ اغراض جن کے لئے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

۳- مصلحانہ جنگ ۔ اصلاحی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں

۴- اشاعت اسلام اور تلوار ۔ دعوت و تبلیغ کے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس امر کی تحقیق کہ اشاعت اسلام میں تلوار کا کیا حصہ ہے۔

۵- قوانین جنگ ۔ اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور اُن میں اسلام کی اصلاحات۔

۶- جنگ دوسرے مذاہب میں ۔ جنگ کے متعلق ہندو مذہب، بودھ مت، یہودیت اور مسیحیت کی تعلیمات پر مفصل تبصرہ۔

۷- جنگ اور تہذیب جدید ۔ بین الاقوامی قانونِ جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون سے اسکا مقابلہ ۔ قیمت مجلد ۵؍ ۔ غیر مجلد للعہ

رسالہ دینیات یہ رسالہ سرکار آصفیہ کے محکمہ تعلیمات نے میٹرک کے طلبہ کو پڑھانے کیلئے لکھوایا ہے ۔ اور علمائے دکن کی ایک مستند مجلس اسکی تالیف میں شریک مشورہ رہی ہے ۔ مسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے ۔ اسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصول شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کیلیے بھی اس رسالہ کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں نیز علما بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے۔

قیمت ۱۰؍

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجیے

ضروری اطلاع

ادارہ دار الاسلام کی مجلس شوریٰ کے فیصلہ کے مطابق ادارہ کا مرکز اور اسکے ساتھ ترجمان القرآن کا دفتر ۵ ذی الحجہ ۵۷ھ (۲۶ جنوری ۳۹ء) کو بستی جمال پور سے لاہور منتقل ہو جائیگا۔ لہذا تاریخ مذکور کے بعد ادارہ دار الاسلام اور دفتر ترجمان القرآن سے جملہ مراسلت ذیل کے پتہ پر کی جائے:-

پونچھ روڈ۔ مبارک پارک۔ لاہور

معاصرین سے بھی گذارش ہے کہ آئندہ اپنے موقر رسائل و جرائد مذکورہ بالا پتہ پر ارسال فرمائیں۔

فہرست مضامین

ماہ ذی القعدہ ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۳۹ء جلد ۱۳ عدد ۵

باہتمام چودھری نیاز علی خاں صاحب پرنٹر وپبلشر، گیلانی الکٹرک پریس لاہور
میں طبع ہوکر دارالاسلام نزد پٹھان کوٹ سے شائع ہؤا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

آج کی اشاعت میں پہلے صفحہ پر ناظرین کو یہ اعلان دیکھ کر حیرت ہوگی کہ ادارہ دارالاسلام کا مرکز اور ترجمان القرآن کا دفتر اس مقام سے (جس کا نام ہی اس نصب العین کی رعایت سے دارالاسلام رکھا گیا تھا) منتقل ہو رہا ہے۔ بلکہ جو حضرات اس اسکیم سے نسبتہً زیادہ گہری دلچسپی لیتے رہے ہیں ان کے لیے تو یہ امر شاید حیرت سے بڑھ کر کچھ پریشانی کا بھی موجب ہو۔ اس لیے مختصراً اس نقل مکان کے وجوہ و اسباب کی طرف اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، ورنہ قابل ترجیح تو یہی تھا کہ یہ معاملہ یونہی خاموشی کے ساتھ گذر جاتا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس ادارہ کے تخیل کو کسی خاص مقام یا سرزمین سے کوئی تعلق نہیں ہے حقیقتہً دارالاسلام تو ہندوستان میں کوئی ایک چپہ بھر زمین بھی نہیں۔ البتہ ہمارا مقصد پورے ہندوستان کو دارالاسلام بنانا ضرور ہے، سو اس مقصد کے لیے اس جزیرہ نما کے ہر خطہ میں ادارۂ دارالاسلام قائم ہو سکتا ہے۔ رہا یہ خاص مقام، تو اس کو میں نے شخصی طور پر، بعض حضرات کی دعوت اور وعدۂ اعانت پر ایک ایسی نمونہ کی بستی کے لیے پسند کیا تھا جہاں دارالاسلام کا نصب العین رکھنے والے ہر حصۂ ملک سے سمٹ کر مجتمع ہو سکیں اور اپنے مقصد کے لیے اجتماعی سعی و جہد کرنے کی قوت و قابلیت بہم پہنچا سکیں۔ اسی خیال کو سامنے رکھ کر میں حیدرآباد سے یہاں ڈیڑھ ہزار میل تک اپنا گھر بار اٹھا لایا تھا اور اپنے نزدیک یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید یہی میرا مستقر بھی ہوگا اور مستودع بھی۔

لیکن جب ادارہ باقاعدہ قائم ہوا اور رفقائے کار مجتمع ہوئے تو تمام حالات کو سامنے رکھ کر بالاتفاق

یہ رائے قائم کی گئی کہ جو مقاصد اور اصول ہمارے پیشِ نظر ہیں ان کے تتبع میں کام کرنے کا موقع یہاں نہیں مل سکتا۔ خود میرا اپنا دس مہینہ کا تجربہ بھی اسی پر شاہد تھا۔ لہٰذا یہ طے ہوا کہ ادارہ کا مرکز یہاں سے کسی مناسب تر مقام پر منتقل کر دیا جائے، اور اس کے لیے متعدد حیثیات سے لاہور کو پسند کیا گیا۔

جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں ہمیں کسی زمین کی خاک سے کوئی دلچسپی و محبت نہیں ہے۔ محبت اس نصب العین سے ہے کہ اللہ کا کلمہ سب کلموں پر غالب اور اس کا قانون سب قوانین سے بالاتر ہو۔ اس کے لیے اس مقصود کے پیچھے جہاں جہاں جانے کی ضرورت ہوگی جائیں گے اور جس جس سرزمین کی خاک چھاننی پڑے گی چھانیں گے۔ مقصد اگر عزیز ہے تو اس کے لیے ہر زحمت گوارا ہونی چاہیے، اور زحمت اگر خوفناک ہے تو مقصد کا نام بھی زبان پر نہ آنا چاہیے، خصوصاً دار الاسلام جیسے مقصد عالی کا نام جسے زبان پر لانے کا حق ہی اس وقت تک کسی کو نہیں پہنچتا جب تک کہ اس کے قلب پر لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ کی عزیمت اور اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ کے سودے پر کامل رضامندی ثبت نہ ہو جائے۔

اس نقل مقام سے ادارہ کے دستور العمل اور لائحہ عمل میں ان شاء اللہ یک سرمو فرق نہ آئے گا۔ البتہ اس لائحہ کا صرف یہ حصہ سردست معرض التوٰی میں رہے گا کہ شہری آبادی سے ہٹ کر ایک علٰحدہ مقام میں دار الاسلامی ماحول پیدا کیا جائے اور وہاں تعلیم و تربیت کے اسباب فراہم کیے جائیں۔ بلاشبہ یہی اس ساری اسکیم کی جان ہے لیکن جس خدا کے نام پر یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے اس سے کچھ بعید نہیں کہ اس کا بھی سامان کر دے وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔

ادارہ کا باقاعدہ قیام اگرچہ حال ہی میں ہوا ہے، لیکن اس کے لیے عملی جد و جہد شروع ہوئے

پورا ایک سال ہو چکا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ایک سال کے واردات و صادرات کا خلاصہ (۵ ذی القعدہ ۵۷ھ ۔ جنوری ۳۹ء تک) پیش کر دیا جائے۔

جمع		خرچ	
عطایا جو معاونین ادارہ سے وصول ہوئے	۸۸۸-۲-۹	طباعت لٹریچر	۴۵۸-۰-۶
عطیہ چودھری نیاز علی خاں صاحب	۲۰۰-۰-۰	ڈاک خرچ	۱۵۲-۶-۹
فروخت کتب	۳۵۷-۳-۳	اسٹیشنری	۴۹-۱۳-۰
زکوٰۃ و صدقات واجبہ	۳۸-۵-۰	متفرق سامان برائے ضروریات ادارہ	۳۱-۶-۹
از ابوالاعلیٰ بصورت کرایہ مکان[1]	۴۶-۱۰-۹	تنخواہ ملازمین	۱۸۵-۱۰-۰
از ابوالاعلیٰ و دیگر ارکان ادارہ بابت قیمت غلہ[1]	۴۹-۸-۰	قرض حسنہ بنام عزیز ہندی صاحب	۲۰۱-۱۴-۳
	۱۵۷۹-۱۳-۹	مصارف دورہ عزیز ہندی صاحب	۱۳-۱۰-۳
		خیرات از مد زکوٰۃ	۲-۴-۰
			۱۰۹۵-۱-۶

جملہ آمدنی	۱۵۷۹ — ۱۳ — ۹
جملہ خرچ	۱۰۹۵ — ۱ — ۶
بقایا	۴۸۴ — ۱۲ — ۳

اس بقایا میں سے جناب چودھری نیاز علی خاں صاحب کے مطالبہ پر ۲۵۲ روپے ۱۲ آنے ان کو نقد واپس کر دیے گئے اور اسٹیشنری (جو ۹ جنوری ۳۹ء کو دفتر ادارہ میں موجود تھی) اور وہ سامان جو ضروریات ادارہ کیلئے خریدا گیا تھا ان کے حوالہ کر دیا گیا[2]۔ اس طرح ٹرسٹ سے جملہ حساب بے باق

[1] مکان سے مراد مکان موقوفہ ہے۔ اور غلہ سے مراد زمین (موقوفہ) کی پیداوار ہے جو ارکان ادارہ نے استعمال کی۔ لہذا کرایہ مکان اور قیمت غلہ کی رقوم دراصل چودھری نیاز علی خاں صاحب کے ٹرسٹ کو ادا کی گئی تھیں اور ٹرسٹ کی طرف سے ادارہ کے بیت المال میں داخل ہوئی تھیں۔

[2] نیز جناب خانصاحب شیخ محمد نصیب صاحب بار ایٹ لا گورداسپور کی طرف سے ان کا عطیہ مبلغ سو روپیہ بھی واپس کر دیا گیا۔

کرنے کے بعد ادارہ کے خزانہ میں صرف ایک سو بتیس روپے باقی ہیں، اور سامان کی صورت میں کچھ موجود نہیں۔

(اس موقع پر مجھے یہ بیان کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ذاتی طور پر میں اور میرا رسالہ ترجمان القرآن کسی شخص یا جماعت کی مالی اعانت کا کبھی شرمندۂ احسان نہیں ہوا۔ میں یہاں اپنے خرچ پر آیا، اپنے خرچ پر رہا اور اپنی شخصی ذمہ داری پر رسالہ چلاتا رہا۔ اس تصریح کی کوئی حاجت نہ تھی اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ بعض حضرات اس باب میں غلط فہمیاں پھیلا رہے ہیں)۔

اس حساب کی رو سے ہم ایک سو بتیس روپے کا عظیم الشان سرمایہ لیے ہوئے دوسرے سال کی سرحد میں داخل ہو رہے ہیں۔ دنیوی لحاظ سے یہ سر و سامان بہت حقیر ہے۔ شائد اسے دیکھ کر لوگ ہمارا مذاق اڑائیں گے کہ اس بل بوتے پر آپ کفر کی اُن زبردست طاقتوں کا مقابلہ کرنے چلے ہیں جن کے سرمایہ کو اربوں اور سنکھوں کے حساب سے بھی شمار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اسلام کی تاریخ پر جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ یہ جب کبھی اٹھا ہے، بے سر و سامانی کے ساتھ ہی اٹھا ہے، اور اسی حال میں اس نے بڑی سر و سامان والی طاقتوں کے ساتھ ٹکر لی ہے۔ لہٰذا سرمایہ کی قلت وہ چیز نہیں ہے جو ہمارا دل توڑنے والی ہو۔ ہاں! دل توڑنے والی چیز اگر کوئی ہے تو وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے سینوں میں اب وہ دل نظر نہیں آتے جو اسلام کی صحیح کیفیت سے سرشار ہوں۔ کاش، ان سو بتیس روپوں کے بجائے صرف سوا پیسے ہمارے بیت المال میں ہوتا مگر ہمارے ساتھ مردانِ حق کی ایک ایسی جماعت صف بستہ ہوتی جن کے دل حب الدنیا وکراھیۃ الموت سے خالی ہوتے۔ یہ ہے وہ اصلی سرمایہ جس کے فقدان کا ہمیں افسوس ہے۔ غلط کہتا ہے جو کہتا ہے کہ مسلمانوں کے پاس دولت نہیں اس لیے یہ کمزور ہیں۔ مسلمانوں میں دولت اب بھی موجود ہے مگر زیادہ تر ان طبقوں میں ہے جو دو خداؤں کی پوجا کرتے ہیں، مسجد میں خداوندِ عالم کی اور مسجد سے باہر شیطان نفس کی۔ اور جن طبقوں میں دولت نہیں ہے ان کے ضعف کا بھی اصلی سبب دولت کا فقدان نہیں بلکہ معبودِ زر کی بندگی ہے جسے راضی کرنے کی فکر ان میں سے بہتوں کو خدا سے بے فکر کر دیتی ہے۔ یہ گھن اس قوم کو سر سے پاؤں تک کھا گیا ہے ورنہ ممکن نہ تھا کہ اس میں حقیقی خدا پرستی زندہ ہوتی اور پھر یہ غلام ہوتی۔

ادارۂ دارالاسلام کا دستور العمل شائع ہوئے تقریباً تین مہینے ہو چکے ہیں۔ اس دوران میں ہمارے ارکان کی تعداد پانچ سے بڑھ کر چھ ہو گئی اور خوشی کی بات ہے کہ چھٹی رکن ایک خاتون ہیں۔ ان کے علاوہ حیدرآباد، مدراس، پشاور، دہلی، لاہور اور پٹنہ سے چھ اصحاب نے اپنے آپ کو رکنیت کے لیے پیش کیا ہے لیکن بنابر احتیاط ان کو ابھی آزمائشی دور میں رکھا گیا ہے تاکہ کچھ مدت تک وہ اپنے نفس کا پورا احتساب کریں اور پہلے خود اس امر کا اندازہ کر لیں کہ آیا وہ رکنیت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے اپنے آپ میں پوری طاقت پاتے ہیں یا نہیں۔ معاونین کی فہرست میں بھی چھ اصحاب نے اپنا نام پیش کیا ہے جسے قبول کر لیا گیا کیونکہ رکنیت کی بہ نسبت اس باب میں کم چھان بین کی ضرورت ہے۔

رفتار ترقی کی سستی بجائے مایوس کن ہونے کے ہمارے لیے امید افزا ہے۔ ہمارے پیش نظر تعداد کی کثرت نہیں بلکہ کیفیت کی شدت ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ جن لوگوں تک اس ادارہ کا تخیل پہنچا ہے وہ اس کے وزن کو محسوس کر رہے ہیں، اور انھیں اس امر کا شعور ہے کہ اس ادارہ کی شرکت عام انجمنوں کی شرکت سے مختلف چیز ہے۔ اسی احساس کا نتیجہ ہے کہ بہت سے وہ لوگ بھی جو ہمارے مقاصد اور طریق کار سے کلی اتفاق رکھتے ہیں، اپنے آپ کو رکنیت یا معاونت کے لیے پیش کرتے ہوئے جھجکتے ہیں، اور جو اقدام کرتے ہیں ان کی محتاط پیش قدمی سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ وہ کسی ہنگامی جوش میں ایسا نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ ان کے گہرے تفکر اور حقیقی شرح صدر کا نتیجہ ہے۔ فطری بات ہے کہ اس صورت میں رفتار ترقی تیز نہیں ہو سکتی، مگر جتنی ترقی بھی ہو گی ان شاء اللہ مستحکم اور پائدار ہو گی۔ اور ہم اپنے آپ کو اس وقت خوش نصیب سمجھیں گے جب اس ٹھنڈی رفتار کے ساتھ ہمیں آٹھ نو کروڑ مسلمانوں کی اس بستی میں سے پچاس مومن قانت مل جائیں گے۔

دوسری طرف بہت سے حضرات نے مراسلات میں بھی اور زبانی گفتگوؤں میں بھی مختلف قسم کے

شبہات کا اظہار کیا جن کا دائرہ اتنے وسیع مباحث پر پھیلا ہوا ہے کہ انھیں سمیٹنے کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ ان سے ہمیں یہ معلوم کرنے کا اچھا موقع مل گیا کہ اس وقت ہمارے ارباب فکر عموماً کس قسم کی الجھنوں میں مبتلا ہیں، اور ساتھ ہی یہ دیکھ کر اطمینان بھی ہوا کہ اس تمام ذہنی بدنظمی کی تہ میں ایک حقیقی تجسس چھپا ہوا ہے جس کی تشفی کا سامان اگر ہم پہنچ جائے تو ہماری قوم کی یہ ساری قوتیں جو فضول ضائع ہو رہی ہیں، رفتہ رفتہ ایک اجتماعی نصب العین کی طلب میں لگ جائیں گی۔

ہر شبہ کا جواب برسر موقع دیا جاتا رہا ہے لیکن ایک خاص شبہ ایسا بھی ہے جسے مختلف پہلوؤں سے مختلف حضرات نے پیش کیا ہے، اور خیال ہوتا ہے کہ شاید وہ نسبتہً زیادہ عام ہے، لہٰذا ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ یہاں اسے بیان کر کے صاف کر دیا جائے۔ اس شبہ کا خلاصہ دو سوالوں کی شکل میں بیان کیا جا سکتا ہے:

(۱) تم نے اس ادارہ کو ایک تربیت گاہ یا ایک علمی مرکز کے بجائے ایک تحریک اور وہ بھی آل انڈیا قسم کی تحریک کی صورت دیدی ہے۔ کیا اس سے تمھارا مقصد آل انڈیا انجمنوں میں ایک اور کا اضافہ کرنا ہے؟

(۲) تم نے مسلمانوں کی تمام انجمنوں پر حتی کہ مسلم لیگ پر بھی، جو تم سے نسبتہً قریب تر تھی تنقید کر ڈالی۔ کیا تم اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ چننا چاہتے ہو اور ان سب کے رقیب کی حیثیت سے میدان میں آ رہے ہو؟

ان دونوں سوالوں کا مختصر جواب ہم ایک ہی سلسلہ میں دیں گے۔

یہ گمان کہ ہم کوئی جمہوری یا عمومی تحریک (Mass. movement) لے کر اٹھ رہے ہیں، صرف اسی ایک بات سے بآسانی دور ہو سکتا ہے کہ ہم نے رکن تو درکنار، معاون بننے کے لیے بھی اتنی کڑی قیود رکھی ہیں جو شاید کسی دوسرے ادارہ میں قیادت علیا کے لیے بھی نہیں ہیں۔ اسی سے اندازہ کر لیا جا سکتا ہے کہ کم از کم مستقبل قریب میں تو یہ ادارہ کوئی عمومی تحریک نہیں بن سکتا۔ اس قسم کا خطرہ جن حضرات کے دل میں گذرا ہے وہ شاید مسلمانوں کی طرف سے بہت ہی خوش گمان واقع ہوئے ہیں کہ اتنی سخت قیود کے باوجود وہ توقع

رکھتے ہیں کہ اس حالت میں اس قوم کے درمیان ایسا ادارہ بھی ایک عمومی ادارہ بن سکتا ہے۔ لیکن اگر فی الواقع ایسا ہو جائے، اگر لاکھوں آدمی دارالاسلام کا نصب العین لے کر اُس کیرکٹر کی طاقت کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوں جس کا نقشہ ہمارے دستور العمل میں پیش کیا گیا ہے تو یہ گھبرانے کی نہیں، خوشی کی بات ہوگی وہ دن تو اسلام کی فتح کا دن ہوگا جس کی تمنا ہر مسلمان کے دل میں ہونی چاہیے نہ کہ خوف!

دستور العمل سے گذر کر جب آپ ہمارے لائحہ عمل کو دیکھیں گے تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ یہ لائحہ عمل کسی آل انڈیا قسم کی عمومی تحریک کا نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ایک خشک، بے مزہ، سخت محنت طلب اور خاموش تعمیری پروگرام ہے جس کو عمل میں لانے کے لیے اعلیٰ درجہ کی اخلاقی، ذہنی اور عملی صلاحیتوں کی ضرورت ہے، لگاتار عمل کی ضرورت ہے اور وہ بھی بے مُزد و بے اجر، ایثار و قربانی کی ضرورت ہے اور وہ بھی صرف آسائش اور جذباتِ نفس ہی کی حد تک نہیں بلکہ مال اور جان کی حد تک بھی۔ کیا یہ چیز عوام کے مطلب کی ہو سکتی ہے کہ اس کی طرف ان کے فوج در فوج متوجہ ہو جانے کا اندیشہ کیا جا سکے؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہم نے اپنے نظام کو ایک مقام پر محدود نہیں رکھا ہے بلکہ ان سب لوگوں کے لیے اس سے وابستہ ہونے کا موقع فراہم کر دیا ہے جو ہمارے ہم خیال ہوں، خواہ ہندوستان کے کسی گوشے میں بیٹھے ہوئے ہوں لیکن اس کا مدعا اس ادارے کو عام اصطلاحی معنوں میں "آل انڈیا" بنانا نہیں ہے بلکہ مقصد کچھ اور ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہندوستان کے ہر کونے میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اسی ایک نصب العین کے لیے جی رہے ہیں جو ہمارے پیش نظر ہے ان میں سے بعض کی قوتیں منتشر سعی و جہد میں ضائع ہو رہی ہیں، اور بعض مایوس بیٹھے ہوئے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ ان سب کو ایک سلک میں منسلک کر دیں تاکہ اس نصب العین کے لیے اجتماعی طاقت فراہم ہو کر۔ انہی لوگوں میں سے، یا ان کے ذریعہ سے ہم کو اپنے کام کے آدمی مل سکیں گے ورنہ یہاں کس کے پاس اتنا وقت اور اتنا سرمایہ ہے کہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں کام کے آدمی ڈھونڈتا پھرے۔ انہی

لوگوں کے ذریعہ سے ہم اپنے خیالات منظم طریقہ پر پھیلا سکیں گے، اور یہی لوگ آخر کار ان تربیت یافتہ آدمیوں کے لیے میدانِ عمل فراہم کریں گے جنھیں ہمارا ادارہ مختلف تعمیری خدمات کے لیے تیار کرے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام فوائد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتے جب تک کہ ادارہ کے نظام کو وسیع نہ کیا جائے۔

بلاشبہ مسلمانوں کو ایک ایسی جمہوری تحریک کی بھی ضرورت ہے جو عوام میں بیداری پیدا کرے اور وسیع پیمانے پر منظم جدوجہد کر کے ہندوستان کی اجتماعی زندگی میں مسلمانوں کے لیے ان کی قوم کے شایانِ شان مرتبہ حاصل کرے۔ جو لوگ اس کام کے لیے موزوں ہیں ان کو یہی کام کرنا چاہیے لیکن اس جمہوری تحریک کی پشت پر ایک ایسی تعمیری تحریک کی بھی ضرورت ہے جو قوم کو بنانے والی حقیقی طاقت فراہم کرے، اور جمہوری حرکت کو حیاتِ اجتماعی کی اصلی غذا بہم پہنچائے۔ صدیوں سے مسلمان اس حقیقت کو بھولے ہوئے ہیں کہ خلافتِ الٰہی کا قیام وہ واحد غرض ہے جس کے لیے ان کو ایک الگ قوم بنایا گیا ہے۔ اسی خود فراموشی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کی قومی تحریکیں، اور ان کے کارکنوں کی طاقتیں ایسے مختلف راستوں پر بھٹکتی رہی ہیں اور اب تک بھٹک رہی ہیں جن میں سے کوئی راستہ بھی سیدھا ان کی منزلِ مقصود کی طرف نہیں جاتا۔ لہٰذا کوئی جماعت ایسی بھی ہونی چاہیے جو ان کے سامنے اس نصب العین کو ہر وقت نمایاں اور روشن کرتی رہے، اور ان کی ہر جمہوری حرکت کو اسی کی طرف بڑھنے پر اکسائے اور اگر اس منتہا سے فروتر کسی مقام پر وہ ٹھیر رہے ہوں تو انھیں دھکیل کر آگے بڑھنے پر مجبور کرے۔ پھر وہ اصلی کمزوری جس نے مسلمانوں کو اپنے قومی نصب العین کی طرف پیش قدمی سے درماندہ کر رکھا ہے، یہ ہے کہ صدیوں سے ان کے ہاں اصولِ اسلام کی بنیاد پر تعمیر کا کام بند پڑا ہے، اور بعد کی نسلیں صرف اسی سرمایہ پر زندگی بسر کرتی رہی ہیں جو ابتدائی تین چار صدیوں میں ان کے قومی معماروں نے فراہم کیا تھا۔ یہ سرمایہ اب بالکل ناکافی ہو چکا ہے۔ زندگی کے بدلے ہوئے حالات میں جس جس قسم کے مسائل سے اب وہ دوچار ہو رہے ہیں ان کا کوئی

مفصل، مرتب، قابلِ عمل حل ان کو نہیں ملتا۔ ان کے ہاں عقائد اور اخلاقیات سے لیکر تمدنی، معاشی، سیاسی اور بین الاقوامی قوانین تک ہر چیز ہزار برس پرانی زبان میں ہے جسے اب کوئی نہیں سمجھ سکتا، اور ہزار برس پرانی زندگی سے وابستہ ہے جو آج کہیں موجود نہیں ہے۔ اگرچہ مسلمان اب بھی کبھی کبھی اسلامی حکومت کا نام زبان پر لے آتے ہیں، لیکن اگر کسی خطۂ ارضی میں ان کو حکومت کا موقع مل بھی جائے تو صحیح معنوں میں کوئی اسلامی حکومت قائم نہیں کرسکتے کیونکہ ان کے پاس اس زمانہ کی ضروریات کے مطابق ایک ترقی پذیر نظامِ تمدن و سیاست کو چلانے کے لیے کوئی چیز بھی مرتب نہیں ہے، حتیٰ کہ قرآن و سنت کے اصول و کلیات کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے والے بھی ان میں کہیں شاذ و نادر ہی ملتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ٹرکی و ایران جیسی سلطنتوں کو مجبوراً فرنگی قوانین کی طرف رجوع کرنا پڑا، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان میں بھی جو لوگ اس وقت اسلام کے نام سے ہماری قومی جمہوری حرکت کو چلا رہے ہیں، وہ غریب صحیح اسلامی اسپرٹ اور صحیح اسلامی اصولوں پر ہمارے قومی مسائل کو حل نہیں کرسکتے۔ پس ہماری ہر جمہوری تحریک کی کامیابی کا، بلکہ ہماری قوم کے مستقبل کا انحصار اس پر ہے کہ ہمارے ہاں ایک جماعت ایسی پیدا ہو جو اس حقیقی ضرورت کو پورا کرے، جو ایک ایسا مخزنِ ہدایت ہو جس کی طرف ہر ضرورت کے موقع پر رجوع کیا جاسکے جس میں اتنی زبردست قوتِ محرکہ موجود ہو کہ موجودہ زمانہ کی غیر اسلامی تحریکات کا نہ صرف مقابلہ کرسکے بلکہ افکار کے سیلاب کا رخ اسلامی نصب العین کی طرف پھیر دے، اور مادی حکومت سے پہلے اسلام کی عقلی و دماغی حکومت قائم کرے۔ خوب یاد رکھنا چاہئے کہ کوئی تہذیب محض سیاسی و فوجی طاقت کے بل پر قائم نہیں رہ سکتی۔ وہ اصلی طاقت جو کسی تہذیب کو قائم کرتی اور قائم رکھتی ہے، عقلی و دماغی طاقت ہے۔ تاتاریوں نے تلوار کے زور سے اسلامی مملکتوں کا تختہ الٹ دیا، مگر وہ کوئی تہذیبی انقلاب برپا نہ کرسکے، بلکہ خود ان کی تہذیب سے مغلوب ہوگئے جن کو انھوں نے تلوار کے زور سے مغلوب کیا تھا، اس لیے کہ ان کے پاس عقلی و دماغی حکومت قائم کرنے والی کوئی طاقت نہ تھی۔ لہٰذا اگر ہمیں سیاسی طاقت حاصل ہو بھی جائے تو ہم اسلام کی حکومت دنیا کے کسی خطہ میں بھی قائم نہیں کرسکتے جب تک کہ ہمارے پاس قرآن کا صحیح فہم نہ ہو، اور اتنی صلاحیت نہ ہو کہ خالص قرآنی بنیادوں پر

کسی تہذیب و تمدن کی عمارت اٹھا سکیں۔

یہی دو کام ہیں جن کے لیے ادارہ دارالاسلام قائم کیا گیا ہے۔ ہمیں اپنے کام اور اس کی نوعیت اور اس کے دائرے کا پورا شعور رہا ہے، اور ہم اپنی تمام کوششوں کو اسی حد کے اندر محدود رکھیں گے جو اس کام کی فطرت چاہتی ہے۔ لہٰذا کسی جماعت کو یہ اندیشہ نہ ہونا چاہیے کہ ہم ان کے دائرۂ عمل میں مداخلت بیجا کریں گے۔ بلکہ اگر وہ سمجھیں تو انہیں خود محسوس ہوجائے گا کہ ہم ان کے رقیب نہیں بلکہ حقیقی خادم ہیں۔

رہیں مسلمانوں کی وہ مختلف جماعتیں جو اس وقت جمہوری تحریکیں چلا رہی ہیں، تو ہمیں معلوم ہے کہ ان میں سے کون ہمارے راستے سے قریب تر ہے اور کون بعید تر۔ لیکن ہم نے قصداً کسی خاص جماعت کی تائید و حمایت سے احتراز کیا ہے تاکہ اس جتھے بندی کے دور میں، جبکہ اشخاص اور پارٹیوں کے لیبل ہی حق اور باطل کے معیار بن کر رہ گئے ہیں، ہم کو کسی پارٹی کا نقیب نہ سمجھ لیا جائے۔ ہمارا خطاب عام ہے۔ ہم ہر مسلمان کو اور مسلمانوں کی ہر جماعت کو اس کا وہ نصب العین یاد دلاتے ہیں جو خدا نے اس کے لیے مقرر کیا ہے، اور دلیل کے ساتھ بتاتے ہیں کہ یہ راستہ تمہیں اس نصب العین کی طرف لے جانے والا ہے، اور وہ راستہ اس سے دور ہٹا دینے والا۔ اب جس کے دل میں خدا کی محبت ہوگی وہ اگر غلطی بھی کر رہا ہوگا تو اس سے باز آجائے گا اور خود ہی اس راستے پر چلا جائے گا جو الٰہی نصب العین کی طرف جانے والا ہے۔ اور جو اشخاص یا پارٹیوں کی محبت میں گرفتار ہوگا وہ اپنی ضد پر اڑا رہے گا، اور اس کی حقیقت آج نہیں تو کل ساری قوم پر کھل جائے گی اور مسلمان بحیثیت مجموعی اس کے فتنے سے بچ جائیں گے۔

اسی طرح تنقید میں بھی ہم نے کبھی کسی کی حمایت یا مخالفت کو مقصود بالذات نہیں بنایا بلکہ ہمیشہ اسلامی نصب العین ہی ہمارا مقصود رہا ہے، اور ہم نے ہر اسلامی جماعت کو اس کی کوتاہیوں پر (خواہ وہ تھوڑی ہوں یا بہت) صرف اس غرض سے متنبہ کیا ہے کہ وہ ان کا تدارک کرکے اس نصب العین کی طرف پیش قدمی کرنے کی قوت و قابلیت بہم پہنچائے۔ ہر جماعت اور ہر رہنما کو ایسے بہت سے لوگوں کی تائید حاصل ہے جو اس کی غلطیوں اور کمزوریوں پر پردہ ڈالتے اور اس کی غیر مشروط حمایت کرتے ہیں۔ اس تائید پیشہ گروہ میں کسی اضافے کی حاجت نہیں۔ البتہ ایک ایسے دردمند دوست کی سب کو ضرورت ہے جو انہیں ان کی کوتاہیوں سے باخبر کرے اور اس خدمت کے معاوضہ میں سب سے برا بننے پر راضی ہو۔ ایک نقطۂ نظر سے یہ حماقت ہے کہ آدمی کسی کو اپنا کر کے نہ رکھے۔ مگر دوسرے نقطۂ نظر سے یہ عقلمندی ہے کہ صرف خدا کو اپنا کر لے۔

مقالات

دین میں تحریف اور بدعت کے اسباب

از افادات حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ

جو صاحب سیاست کبریٰ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا دین لے کر آیا ہو جو تمام ادیان کا ناسخ ہو اس کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ اپنے دین کو فتنۂ تحریف کی دست برد سے محفوظ کر دے۔ کیونکہ اس کی عام اور ہمہ گیر دعوت مختلف استعداد مختلف مزاج اور مختلف اغراض و مقاصد رکھنے والی جماعتوں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کرتی ہے۔

ایسا ہوا کرتا ہے کہ لوگ اپنی ہوا پرستی یا اپنے پہلے مذہب کی محبت کی وجہ سے یا مصالح شریعت کا کامل احاطہ نہ کرنے والی فہم نارسا کے اشارہ پر بہت سی منصوص تعلیمات شرع کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ اور کبھی اس میں غیر شرعی تخیلات اور تعلیمات ٹھونس دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سارا دین مسخ اور درہم برہم ہو جاتا ہے جیسا کہ بہت سے قدیم مذاہب کی تاریخ گواہ ہے۔ لیکن چونکہ اس فتنہ کے دروازے بے شمار اور ان کی تعداد غیر متعین ہے اور سب کا استقصاء ممکن نہیں۔ لہٰذا شارع کے لئے ضروری تھا کہ امت کو اجمالاً اسباب تحریف سے ڈرا کر متنبہ کر دے اور اس کے لئے چند ایسے اصولی مسائل کو مخصوص کر دے جن کے بارے میں قیاس کہتا ہے کہ عموماً تہاون اور تحریف کے فتنے بنی نوع انسان میں انہیں راستوں سے گھسا کرتے ہیں۔ اور ان راستوں کو اچھی طرح بند کر دے۔ اس تہدید و انذار کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی شریعت میں ایسی چیزوں کو داخل کرے جو مسخ شدہ اور باطل مذاہب کے اصولی اور مشہور ترین رسوم و شعائر کے بالکل مخالف

ہوں مثلاً نماز وغیرہ۔ تاکہ کوئی ظاہری تشابہ باقی نہ رہ جائے اور کسی پرانے مذہب کے شعائر سے مداہنت کا امکان باقی نہ رہے۔

تہاون تحریف کے اسباب میں سے ایک تہاون ہے یعنی احکام شرع سے بے پروائی۔ تہاون کی حقیقت یہ ہے کہ رسول کی تربیت یافتہ حواریوں کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہونے لگیں جو نماز کو ضائع کرکے شہوات کی پیروی میں غرق ہوں، علم و عمل اور تعلیم و تعلم کے ذریعہ دین کی اشاعت کا اہتمام چھوڑ دیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ سے کنارہ کش ہوجائیں۔ اور اس طرح چند روز بعد مخالف دین رسوم پیدا ہوجائیں اور بحیثیت مجموعی عام طبائع انسانی کا رجحان مزاج شریعت کے خلاف ہوجائے۔ پھر ایسے دوسرے خلف آئیں جو شریعت سے بے اعتنائی کے اس جرم میں اور زیادہ آگے بڑھ جائیں یہاں تک کہ علم دین کا اکثر حصہ نسیاً منسیاً ہوکر رہ جائے۔ یوں تو امت کے ہر طبقہ کا تہاون خطرناک اور مضرت رساں ہے مگر جب اس کا صدور رؤسا و اکابر قوم سے ہو تو پھر اس کی مضرتوں کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ اسی سبب سے حضرت نوح و ابراہیم علیہما السلام کی شریعتیں برباد ہوگئیں اور آج اس کے اصلی خط و خال کا سراغ لگانا قریباً ناممکن ہوگیا ہے۔

تہاون کے چند اسباب و ذرائع ہیں۔

(۱) پہلا سرچشمہ تہاون کا صاحب شریعت کی روایات کو محفوظ نہ رکھنا اور ان کے مطابق عمل نہ کرنا ہے۔

مندرجہ ذیل ارشاد نبوی اسی فتنہ سے باخبر کررہا ہے:۔

"دیکھو! عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب طعام و شراب سے ایک بدمست انسان اپنے تخت پر بیٹھ کر کہے گا کہ تم اس قرآن کو مضبوط پکڑ لو اور اس میں جس چیز کو حرام پاؤ اسی کو حرام سمجھو اور جس شے کو حلال پاؤ اسی کو حلال سمجھو۔ حالانکہ خدا کے رسول کی حرام کی ہوئی چیز بھی ویسی

ہی قطعی الحرمت ہے جیسی خود اللہ کی حرام کی ہوئی"۔

اسی بات کو دوسری جگہ یوں فرمایا :۔

"اللہ تعالیٰ لوگوں کے سینوں سے علم نہیں اٹھائے گا بلکہ علماء کو اٹھائے گا اور ان کے اٹھ جانے سے علم اٹھ جائے گا۔ یہاں تک کہ جب کوئی عالم باقی نہ رہ جائے گا اس وقت لوگ جاہلوں کو امام بنا کر ان کی طرف رجوع کرنے لگیں گے، ان سے مسئلہ پوچھا جائے گا اور وہ بغیر کسی علم و بصیرت کے فتویٰ دیں گے۔ خود گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہی کے جہنم میں ڈال دیں گے"۔

(۲) دوسرا سبب ایسی اغراض فاسدہ ہیں جو من گھڑت تاویلات پر آمادہ کرتی ہیں مثلاً نفس پرست امراء و ملوک کی طلب رضا جس کی وجہ سے انسان اُن کی ہوا پرستیوں کے لئے کلام الٰہی کی غلط تاویلیں کرکے سند جواز مہیا کرتا ہے۔ آیت ذیل ایسے ہی ایمان فروشوں کو مخاطب کرتی ہے :۔

"جو لوگ اللہ کے نازل کئے ہوئے احکام کو چھپاتے ہیں اور اس کے عوض تھوڑا سا معاوضہ حاصل کرتے ہیں، وہ اور تو کچھ نہیں مگر اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں"۔ (بقرہ۔ رکوع ۲۱)

(۳) تہاون کا تیسرا منبع منکرات اور فاحشات کا امت میں پھیل جانا اور علماء کا ان پر خاموشی اختیار کر لینا ہے۔ اسی حالت کے متعلق قرآن کہتا ہے :۔

"تم سے پہلے گذرنے والی اقوام میں ایسے ارباب خیر کیوں نہ ہوئے جو لوگوں کو ارض الٰہی میں فساد برپا کرنے سے روکتے۔ (ہاں ایسے لوگ تھے تو سہی) مگر بہت کم تھے جنھیں ہم نے عذاب سے بچا لیا۔ رہے ظالم و نافرمان لوگ تو وہ اسی لذت دنیوی میں سرشار رہے جو انہیں دی گئی تھی اور یہ لوگ کچھ تھے ہی بدکردار"۔ (ہود۔ رکوع ۱۰)

بنی اسرائیل کی معصیت پرستی پر تبصرہ کرتے ہوئے آنحضرت صلعم فرماتے ہیں :۔

"ان کے علماء نے انہیں برائیوں سے روکا لیکن وہ نہ رکے۔ پھر علماء ان سے قطع تعلق کرنے کے بجائے ان کی مجلسوں میں اٹھنے بیٹھنے اور ان کے ساتھ کھانے پینے لگے۔ آخرکار اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو ایک دوسرے سے مار دیا (یعنی سب کو معصیت کی سیاہی میں رنگ دیا) اور داؤد[ع] وعیسیٰ ابن مریم[ع] کی زبان سے ان پر لعنت کی، کیونکہ وہ خدا کی نافرمانی کرتے اور حد سے بڑھ گئے تھے۔"

تعمق

تحریف کا دوسرا سبب تَعَمُّق ہے یعنی خواہ مخواہ بال کی کھال نکالنا۔ اس کی متعدد صورتیں ہیں، مثلاً یہ[۱] کہ جب شارع کسی چیز کا حکم دے یا کسی کام سے روکے تو اس کے حکم کو سن کر کوئی شخص اپنے ذہن کے مطابق خود ایک معنی متعین کرے پھر وہی حکم اپنی طرف سے کسی ایسی دوسری چیز پر عائد کر دے جو بعض وجوہ سے پہلی شے کے مشابہ ہو، یا دونوں میں کسی پہلو سے اس کو اشتراک علت نظر آئے۔ یا[۲] ایک شے کے حکم کو اس کے تمام اشکال اور مظنات اور اجزاء پر علیحدہ علیحدہ جاری کر دے۔ یا[۳] جب کبھی روایات کے تعارض کی وجہ سے اصل حکم اور اس کے صحیح محل و موقع کی تمیز نہ کر سکے تو تمام صورتوں میں سے سخت ترین صورت کو اختیار کر کے اُسے واجب سمجھ لے۔ یا[۴] رسول اللہ صلعم کے ہر فعل کو عبادت پر محمول کرے (حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے بہت سے افعال محض عادۃً کے طور پر کئے ہیں، عبادت سے ان کا کوئی تعلق نہیں) اور یہ خیال کر کے کہ یہ تمام امور شریعت کی حیثیت رکھتے ہیں اور امر و نہی کے ذیل میں آتے ہیں، حکم لگا دے کہ خدا نے ان کاموں سے روکا ہے اور ان کاموں کا حکم دیا ہے۔ یہ تمام صورتیں تعمق فی الدین کی ہیں۔ مثال کے طور پر روزہ کے احکام کو لے لو۔ شارع نے جب نفس حیوانی کو مغلوب کرنے کے لئے روزہ رکھنے کا حکم دیا اور اس میں مباشرت سے منع فرمایا تو بعض لوگوں نے سمجھا کہ سحری کھانا بھی خلافِ شرع ہے کیونکہ اس سے روزہ کا مقصد (یعنی نفس کشی) فوت ہو جاتا ہے۔ نیز روزہ دار کے لئے بیوی کا بوسہ لینا بھی ناجائز ہے کیونکہ وہ بھی مباشرت کا داعیہ ہے، بلکہ قضائے شہوت میں ایک طرح مباشرت کے مشابہ ہے۔ رسول اللہ صلعم کو جب ان خیالات کی اطلاع پہنچی تو آپ نے ان کی غلطیوں کو واضح

کر کے فرمایا کہ اس قسم کا قیاس تحریف دین ہے۔

تشدد تحریف و بدعت کا تیسرا دروازہ تشدد ہے، یعنی ایسی سخت اور شاق عبادتوں کا اختیار کرنا جن کا شارع نے حکم نہیں دیا۔ مثلاً مسلسل روزے رکھنا، ہر وقت نماز و مراقبہ میں مصروف رہنا، تجرد اختیار کرنا، سنن و آداب کا واجب اور فرض کی طرح التزام و اہتمام کرنا وغیرہ۔ چنانچہ جب حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور عثمان ابن مظعون رضی اللہ عنہما نے ایسی ہی سخت ریاضتوں کا ارادہ کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں منع کرتے ہوئے فرمایا کہ "جب کوئی شخص دین کے ساتھ سختی برتے گا اور اپنے نفس کو ناقابل برداشت عبادتوں میں مبتلا کرے گا، تو وہ دین کی پیروی سے عاجز ہو جائے گا"۔

اس تعمق یا تشدد کو اختیار کرنے والا جب کسی گروہ کا امام اور معلم بن جاتا ہے تو اس کے مقلد یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ سارے امور جنھیں ان کا امام بطور عبادت کے سرانجام دے رہا ہے شرعی احکام ہیں۔ اس طرح یہ تمام چیزیں جزدِ دین خیال کی جانے لگتی ہیں۔ یہود اور عیسائی راہبوں کی یہی وہ خطرناک روش تھی جس نے دین کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

استحسان تیسرا سبب استحسان ہے، یعنی جاہلانہ قیاس آرائی۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص شارع کے طریق تشریع پر نگاہ ڈال کر دیکھتا ہے کہ وہ ہر مصلحت اور حکمت کے لئے ایک مناسب مظنة مقرر کرتا اور ہر ایک مقصد کے حصول کے لئے ایک موزوں قالب معین کرتا ہے لیکن چونکہ یہ شخص نگاہِ نبوت کی حقیقت شناسی اور وسعت سے قدرتاً محروم ہوتا ہے اور اسرار تشریع کے تمام پہلوؤں کو نہیں دیکھ سکتا، اس لئے وہ ایک آدھ مصلحت کو اچک کر اپنی فہم کے مطابق شریعت کی دفعات بنانے لگتا ہے۔ یہود کی مثال تمھارے سامنے ہے۔ انھوں نے خیال کیا کہ شارع نے معاصی سے روکنے کے لئے حدود کا حکم محض اس لئے دیا ہے کہ دنیا میں امن قائم ہو اور معاملات درست رہیں۔ پھر انہیں یہ نظر آیا کہ زانی کے لئے جو سزائے رجم شارع نے مقرر کر رکھی ہے اس سے آج کل اختلاف اور جدال و قتال پیدا ہوتا ہے، جو بدترین فساد ہے۔ یہ سوچ کر انھوں نے

رجم کی سزا کو مجرم کا منہ کالا کرنے اور کوڑے مارنے کی سزا سے بدل دینا بہتر سمجھا، اور ایسا کیا بھی۔ رسول اللہ صلعم نے ان کے اس فعل کو تحریف اور ترک احکام الہٰی قرار دیا۔

ابن سیرین سے روایت ہے کہ :۔

"سب سے پہلے ابلیس نے قیاس کیا۔ چاند اور سورج کی پرستش محض قیاس نے کرائی"۔

امام حسنؒ نے آیت خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ پڑھ کر فرمایا "یہاں ابلیس نے قیاس کیا تھا اور وہ سب سے پہلا قیاس کرنے والا ہے"۔

امام شعبیؒ سے منقول ہے کہ :۔

"قسم خدا کی اگر تم نے قیاس سے کام لیا تو حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر کے رہو گے"۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ :۔

"تین چیزیں قصر اسلام کو ڈھا دیں گی، ایک عالم کی لغزش، دوسری منافق کا قرآن سے استدلال تیسری گمراہ ائمہ کے احکام"۔

یہ تمام باتیں اس قیاس کے متعلق ہیں جس کا سر رشتہ کتاب و سنت سے نہ ہو، بلکہ محض وہمی و عقلی ہو۔

اتباع اجماع فتنۂ تحریف کا چوتھا ذریعہ اتباع اجماع ہے۔ اجماع سے مراد یہ ہے کہ حاملین شریعت کا ایک گروہ، جس کی اصابت رائے پر عام لوگوں کو اعتقاد ہو، کسی چیز پر اتفاق کرے اور لوگ یہ سمجھیں کہ مجرد یہ اتفاق ہی حجت شرعی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس قسم کا اتباع اجماع اسوقت تحریف دین کے مترادف ہوجاتا ہے جب اس اجماع کی اصل کتاب و سنت میں موجود نہ ہو۔ اور یہ وہ اجماع نہیں ہے جس کے حجت ہونے پر امت کا اتفاق ہے۔ کیونکہ امت کا اتفاق تو اسی اجماع کے اتباع پر ہے جس کی سند کتاب و سنت میں موجود ہو یا جو کتاب و سنت سے مستنبط ہو۔ رہا وہ اجماع جس کی اصل نہ قرآن میں ہو نہ حدیث میں، سو اس کو کسی نے بھی حجت نہیں مانا۔ بلکہ اس کے اتباع کی مذمت میں تو قرآن کہتا ہے کہ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا

عَلَیۡہِ اٰبَآءَنَا۔ جب ان سے کہا گیا کہ ایمان لاؤ اس چیز پر جو خدا نے اتاری ہے تو انھوں نے کہدیا کہ ہم تو اس طریقہ کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا" حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے انکار میں یہود نے جو دلیل پیش کی تھی وہ اسی اتباع اجماع پر مبنی تھی۔ ان کے اسلاف نے بزعم خود ان انبیائے صادقین کے حالات کا تفحص کیا اور انہیں نبوت کے معیار پر نہ پایا، لہذا ان کا انکار ہمیشہ کے لئے ایک برہان قاطع بن گیا۔ نصاریٰ کے اندر بھی اسی اتباع اجماع نے بے شمار گمراہیاں پیدا کر رکھی ہیں۔ ان میں توراۃ و انجیل کے خلاف اور ان کے احکام سے زائد صدہا باتیں شریعت کی حیثیت سے موجود ہیں، جن کے بارے میں ان کے پاس "اجماع سلف" کے سوا اور کوئی دلیل نہیں۔

تقلید | پانچواں سرچشمہ جہاں سے تحریفِ دین کا سیلاب پھوٹتا ہے کسی غیر معصوم (غیر نبی) انسان کی کورانہ تقلید ہے یعنی کوئی عالم دین کسی مسئلہ میں اجتہاد کرے اور اس کے مقلدین بغیر دلیل و حجت محض حسن ظن کی بنا پر یہ خیال کرلیں کہ امام کا اجتہاد قطعاً یا غالباً صحیح ہے، پھر اس خیال کے ماتحت کسی صحیح حدیث کو اس کے اجتہاد سے رد کر دیں۔ یہ تقلید وہ تقلید نہیں ہے جس کے جواز پر امت مرحومہ کا اتفاق ہے۔ امت نے مجتہدین کی تقلید کے جواز پر جو اتفاق کیا ہے وہ چند قیود کے ساتھ ہے۔ اولاً آدمی کو یہ علم و اعتقاد رکھنا چاہئے کہ مجتہد معصوم نہیں ہے، اس کا اجتہاد صحیح بھی ہوتا ہے اور غلط بھی۔ ثانیاً اسے ہمہ وقت ارشادِ نبوی کی تلاش میں اس عزم کے ساتھ لگا رہنا چاہئے کہ جب کبھی کوئی صحیح حدیث اجتہادِ امام کے خلاف مل جائے گی تو وہ امام کی تقلید اس مسئلہ میں ترک کر دے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت اِتَّخَذُوۡۤا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ کے متعلق فرمایا کہ یہود اپنے علماء و مشائخ کی پرستش نہیں کرتے تھے بلکہ کرتے یہ تھے کہ جس چیز کو یہ لوگ حلال کہہ دیتے اسے وہ بغیر کسی حجت شرعی کے حلال سمجھ لیتے تھے اور جسے یہ حرام کہہ دیتے اسے حرام سمجھ لیتے تھے۔

خلط مذاہب | دین کے اندر فتنۂ تحریف کے گھسنے کا چھٹا راستہ مختلف مذاہب اور شرائع کا باہم اس

طرح خلط ملط کر دینا ہے کہ ایک دوسرے سے تمیز نہ ہو سکے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک آدمی پہلے
کسی اور مذہب کا پیرو رہتا ہے اور اس کے دل و دماغ پر اپنی سابق مذہبی سوسائٹی کے علوم و نظریات
پوری طرح حاوی ہوتے ہیں۔ پھر وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوتا ہے لیکن قلب میں اُن پرانی نقوش
کا اثر باقی رہتا ہے، انجام کار یہاں بھی وہ ان علوم و نظریات کی توقیر و قبولیت چاہتا ہے خواہ وہ بجائے
خود کیسے ہی بے جان اور بے اصل ہوں۔ حتیٰ کہ بسا اوقات وہ اس کے نئے روایتیں گھڑنے پر اتر آتا ہے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "بنی اسرائیل برابر
راہِ اعتدال پر قائم رہے یہاں تک کہ ان میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جو خالص اسرائیلی نہ تھے (باپ اسرائیلی
تھا اور ماں دوسری قوم سے) یعنی لونڈی زادے تھے۔ ان لوگوں نے دین میں رائے کو دخل دیا نتیجہ
یہ ہوا کہ خود گمراہ ہوئے اوروں کو بھی گمراہ کر دیا"۔ چنانچہ خود ہمارے دین میں بھی آج بے شمار علوم اسی
نوع کے داخل ہو چکے ہیں مثلاً اسرائیلی علوم، خطبا، جاہلیت کے اقوال، یونان کا فلسفہ، ایران
کی تاریخ، علم نجوم، رمل اور علم کلام وغیرہ۔ رسول اللہ صلعم کے حضور میں جب توراۃ پڑھی گئی
تو آپ بہت خفا ہوئے، اس خفگی میں یہی راز تھا۔ نیز کتاب دانیالؑ کے طالب کو حضرت عمر رضی اللہ
عنہ نے اسی وجہ سے سزا دی تھی۔ (ماخوذ از حجۃ اللہ البالغہ)

دلائل السنن والآثار

از

جناب مولانا نجم الدین صاحب اصلاحی

(۱)

جس طرح آج کل موجودہ سیاسی کشمکش مسلمانوں کے لئے انتہائی صبر آزما اور فتنے کا باعث ہے اسی طرح اہل علم اور مسلمانوں کے لئے "دو" اور فتنے سخت ہیں۔ ایک "تکفیر و تفسیق" دوسرا "انکار حجیت حدیث"۔ اول الذکر کے متعلق ایک مضمون بعنوان "کفر و ایمان" رسالہ ترجمان القرآن ماہ شوال ۱۳۵۵ھ میں احتیاط و ذمہ داری سے شائع ہو چکا ہے جس میں اہل علم کی تحقیقات جو تمام تر کتاب و سنت سے ماخوذ ہیں پیش کر دی گئی ہیں۔ اب مؤخر الذکر پر اصولی حیثیت سے گفتگو کی جاتی ہے۔ شاید میری یہ کاوش خدا کے نزدیک شرف قبول حاصل کرے اور لوگوں کے لئے مفید ثابت ہو وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللہِ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ طالب حقیقت کے لئے ہر ہر قدم پر دو مشکلیں پیش آتی ہیں۔ ایک طرف تو یہ کہ وہ کسی مسئلہ کو محض اسلئے کہ فلاں شخص نے کہا ہے صحیح نہیں مانتا بلکہ بڑے سے بڑے عالم کی رائے کا غلط ہونا ممکن سمجھتا ہے، دوسری طرف ائمہ کی رایوں کو بغیر کامل غور کے غلط سمجھنا خود نہایت خطرناک ہے۔ جس مسئلہ میں کسی امام نے غلطی کی ہے اس میں طالب حقیقت بھی ممکن ہے کہ غلطی کر جائے اور سب سے بڑی غلطی یہ ہوگی کہ صحیح رائے موجود ہونے کے ساتھ اس کے نہ سمجھنے کی وجہ سے غلطی میں پڑے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ چراغ ہوتے ہوئے آدمی اپنی غفلت سے ٹھوکر کھائے۔ حضرت امام غزالیؒ کا یہ قول کس قدر ٹھیک اور نصیحت بخش ہے کہ جس نے تنک نہیں کیا وہ تحقیق

نہیں کرے گا اور جو تحقیق نہیں کرے گا وہ ہمیشہ اندھا رہے گا۔ اسی اندھے پن کے دور ہونے کا نام بصیرت، یقین، ایمان، ایقان، کشفِ غطا، اطمینانِ قلب اور ثلجِ صدر و علم و معرفت ہے۔ بلا شبہ شک کی تہ میں دو چیزیں ہیں جو تحقیق کی بنیاد ہیں، جہل اور اس کی ناگواری۔ جب انسان اپنے تقلیدی علم کی بے حقیقتی کو سمجھتا ہے تو وہ علم اس کو جہل معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنے علم کو علم نہیں سمجھتا، اور جب اس پر یہ حالت پوری طرح طاری ہو جاتی ہے تو طبیعت فطرتاً علم کی خواہش مند ہوتی ہے۔ پس طالبِ حقیقت کو ایک طرف آزادی اور دوسری طرف وقعتِ رائے سلف کا خیال رکھ کر قدم رکھنا ہوتا ہے۔ چونکہ یہ دونوں پہلو مخالف یکدیگر ہیں لہذا اگر ایک طرف اس نے زیادتی کی تو دوسری طرف کمی کر دے گا ایسی ہی خیال کا اثر تھا اس شخص پر جس نے یہ کہا ہے کہ؎

مراد خضر عناں گیر باید از چپ و راست ... کہ کجروی نہ کنم ورنہ عزم راہ خطا است

پس کسی حکیم و امام کی ایسی رائے کے متعلق جو بادی النظر میں غلط معلوم ہوتی ہو زیادہ غور و فکر کی ضرورت ہے اور سخت احتیاط درکار ہے۔ بالخصوص ایسے مسائل میں جو معرکۃ الآراء رہے ہیں، ورنہ طالبِ حق سلف سے فائدہ نہیں اٹھا سکے گا اور آزادی اس کو اس سے زیادہ سطحی بنا دے گی جتنا تقلید سے ڈر ہے۔ ممکن ہے کہ اس آزادی اور حریت بلکہ نام نہاد تحقیق کے زمانہ میں کسی کو "وقعتِ رائے سلف" کے جملہ سے اختلاف ہو سو اس کو قرآن حکیم میں سورۂ حشر کی دسویں آیت وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ الخ پر غور کرنا چاہئے جس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ وہ لوگ جو مہاجرین و انصار کے بعد عالمِ وجود میں آئے وہ سابقین کے لئے دعاءِ مغفرت کرتے ہیں اور کسی مسلمان بھائی کی طرف سے دل میں عداوت اور بغض نہیں رکھتے بلکہ ظنوا المومنین خیرا پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

لیکن آج یہ عالم ہے کہ بلا سوچے سمجھے سب سے پہلے سلف کی خدمات اور ان کی جد و جہد اور ناقابلِ انکار

ومحیر العقول علمی وعملی کارناموں پر تیشہ چلادیا جاتا ہے۔ میرے نزدیک یہ وبا دو طرح سے پھیلی۔ ایک تعلیم قرآن کی کمی، احادیث نبوی سے بے اعتنائی اور ان کے تراجم کی کثرت۔ دوسرے ایک محدود نصاب تعلیم اور انگریزی تمدن تہذیب کی تقلید وغیرہ۔ یقیناً مترجمین کی نیتیں صالح اور مقاصد بلند تھے لیکن اس کا دوسرا رخ نہایت خطرناک تھا جس کا تجربہ و مشاہدہ آج ہر ہر قدم پر ہو رہا ہے۔ ہاں یہ بات خیال میں رکھنی چاہئے کہ مروجہ نصاب تعلیم جس میں زیادہ تر جماعتی عصبیت کے ماتحت تعلیم دی جاتی ہے اس سے نہ تو تحقیق کا دروازہ کھل سکتا ہے اور نہ اجتہاد و تفقہ فی الدین کا ملکہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہی ہوتا تو پھر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو ۸ سال تک صرف سورۂ بقرہ کے حقائق و معارف بارگاہِ رسالت میں نہ حل کرنے پڑتے، نہ حضرت مجاہد بن جبیرؒ کو تین بار تفسیر قرآن حضرت عبداللہ ابن عباس سے پڑھنے کی نوبت آتی، نہ ابو محمد عبداللہ بن عطیۃ الدمشقی المتوفی ۳۸۳ھ کو قرآن کے افہام و تفہیم کیلئے ۵ ہزار اشعار حفظ کرنے پڑتے، اور نہ امام ابن تیمیہؒ کو ایک ایک آیت قرآن پر سو سو تفسیریں دیکھنی پڑتیں اور پھر متروک و غیر آباد مسجد میں جا کر بارگاہ رب العزت میں "یا رب ابراھیم فھمنی" کی دعائیں مانگنی پڑتیں اور اس وقت تک یہ مشغلہ جاری رہتا جب تک کہ شرح صدر نصیب نہ ہو جاتا[1]، نہ حضرت شاہ عبدالقادرؒ کو ۴۰ سال مسجد میں معتکف رہ کر درس و تدریس کلام الٰہی میں بسر کردینے کی ضرورت تھی، نہ استاذ امام علامہ فراہیؒ کو ۳۰۔۴۰ سال اس لیلائے مقصود کی طلب میں دل و دماغ کو محو کردینا پڑتا۔

بلاریب وسائل و ذرائع اور علوم الٰہیہ کی تحصیل کے بعد افہام و تفہیم کلام الٰہی کا واحد ذریعہ اگر کوئی چیز ہے تو وہ تزکیۂ نفس اور فیضان الٰہی ہے۔ اسی حقیقت کی جانب حضرت علامہ اقبالؒ اشارہ فرماتے ہیں:۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب　　　گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

آنحضرت صلعم کی صفت قرآن نے جا بجا یہ بیان کی ہے، یَتْلُوا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ۔ یہ تلاوت آیات، تزکیۂ نفس اور تعلیم کتاب و حکمت پر بھی کبھی غور

[1] الرد الوافر

کیا گیا ہے؟ اس کا جواب خود شمع نبوت کے پروانوں کی زبانوں سے سنیئے۔

حرف از زبان دوست شنیدن چہ خوش بود یا از زبان آنکہ شنید از زبان دوست

حضرت ابوعبدالرحمٰن سلمیؓ صحابہ کرام کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ہم انحضرت صلعم سے قرآن مجید کی دس دس آیات پڑھا کرتے تھے۔ الفاظ کے ساتھ عمل کا طریقہ بھی سیکھتے جاتے۔ جب ہم قرآن کا ایک حصہ ختم کرتے تو الفاظ و معانی کے ساتھ اس کے طریق عمل سے بھی واقف ہوتے جاتے[1]۔ حضرت عمر بن الخطابؓ فرماتے تھے کاش میں تین باتوں کی بابت تفصیلی معلومات آپ سے حاصل کر لیتا کہ آپ ہمیں فیصلہ کن معلومات دیتے۔ دادا کی میراث کا مسئلہ، کلالہ اور چند مسائل ربوا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں خدا کی قسم قرآن کی کوئی سورت ایسی نہیں جس کے متعلق مجھے یہ علم نہ ہو کہ کہاں اتری اور کس کے متعلق۔ اگر مجھے یہ علم ہو جائے کہ مجھ سے زیادہ کسی کو قرآن کا علم ہے اور سواری وہاں تک پہنچ سکے تو یقیناً اس کے پاس جا کر علم قرآن حاصل کروں۔ تمام صحابہ اس سے بخوبی واقف ہیں کہ میں سب سے قرآن کی بابت زیادہ واقف ہوں حالانکہ میں سب سے بہتر نہیں ہوں[2]۔ حبرالامۃ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے متعلق تو پوچھنا نہیں کیونکہ یہاں تو ملکوتی تائید "اللّٰھم علمہ الکتاب" حاصل تھی۔ ان واقعات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کا ادعائے علم قرآن اس دریا کے مقابل قطرہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتا۔ بلاشبہ آج وسائل و ذرائع کی فراوانی سے تحصیل علوم و فنون کے لئے جو دشواریاں اگلوں کو تھیں وہ اب باقی نہیں رہیں۔ تاہم بارگاہ رسالت سے بواسطہ او بلا واسطہ فیض پانے والوں کی ہمسری کا دعویٰ کون کر سکتا ہے؟ کہ یہاں تو فانھم ابر ھٰذہ الامۃ قلوبا واعمقھا علما واقلھا تکلفا۔ اور شھداء للّٰہ علی الناس کی سند حاصل ہو چکی تھی۔

بہت ممکن ہے کہ کسی کو میری اس بات سے یہ گمان ہو کہ میں تفسیر کی ہر اس روایت کو صحیح سمجھتا ہوں جو بطریق حدثنا و اخبرنا ابن جریر و درمنثور وغیرہ میں موجود ہے۔ سو میرا یہ خیال ہرگز نہیں ہے، اور یہ بھی

[1] ابن جریر [2] بخاری و مسلم

نہیں ہے کہ تمام کو ترک کرکے، خود ساختہ اصول کے ماتحت قرآن حکیم کے افہام وتفہیم کے صدہا حقائق ومعارف کو چھوڑ کر سلف کے طریق تفسیر کو بے معنی یقین کروں۔ کیونکہ مجھے علم ہے کہ تفسیری روایتوں میں سب سے زیادہ کمزور اور لغو طریق تفسیر کلبی ابو نصر محمد بن سائب کا ہے اور اگر محمد بن مروان سدی صغیر کی روایت کو شامل کر لیا جائے تو یہ سلسلہ پورا کا پورا سلسلۂ کذب بن جاتا ہے۔ اسی طرح طریق مقاتل بن سلیمان ازدی اور ضحاک بھی منقطع ہے۔ بے شک طریق قیس بن مسلم کوفی جو عطاء بن سائب سے روایت کرتے ہیں اور طریق ابن اسحٰق جید اور صحیح ہیں۔ صحابہ میں جن سے تفسیری روایتیں کم ہیں وہ انس بن مالک رضؓ، ابو ہریرہ رضؓ، عبداللہ بن عمر رضؓ، جابر بن عبداللہ رضؓ ابو موسیٰ اشعری رضؓ، عبداللہ بن عمرو بن العاص رضؓ، زید بن ثابت کاتب وحی رضؓ ہیں۔ تابعین میں اصحاب عبداللہ بن عباس یعنی علمائے مکہ مکرمہ ہیں جن میں مجاہد بن جبیر المتوفی ۱۰۳ھ کی تفسیر پر امام شافعی اور امام بخاری وغیرہ نے اعتماد کیا ہے۔ علامہ ابن جوزیؒ اور سیوطیؒ وغیرہ نے طبقات مفسرین میں حقیقت بالا کا ذکر کیا ہے جس سے میرے بیان کی تائید ہوتی ہے جو اہل علم پر مخفی نہیں۔

قرآن حکیم نے مختلف مقامات پر تدبر وتفکر کی جو ترغیب دلائی ہے سو اس کا یہ مقصد نہیں کہ علوم الٰہیہ اور سنن نبویہ، واشارات سلف کو ترک کرتے ہوئے حسبنا کتاب اللہ کی آڑ میں اپنے اہواء وخواہشات کے ماتحت قرآن کی تفسیر شروع کر دی جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہدایت کے بجائے ضلالت کی نشر واشاعت ہوگی اور شاید اسی لئے قرآن نے بھی یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا سے اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور شارع علیہ السلام نے اس کی تشریح من قال فی القرآن برأیہ الخ سے فرماکر ہمیشہ کے لئے اس خطرہ کا سد باب کر دیا ہے۔

مجھے اس وقت اصول تاویل پر گفتگو کرنی نہیں ہے تفصیل کے لئے فوز الکبیر وغیرہ کا مطالعہ کیا جائے۔ مختصراً یہ مدنظر رکھنا چاہئے کہ قرآن کی تفسیر جہاں تک ممکن ہو قرآن کی دوسری آیات سے کرنی چاہئے۔ پھر نظم کلام، سیاق وسباق آیات، شواہد کلام عرب، سنن وآثار نبویہ، اور طریق تفسیر اصحاب رسول اللہ صلعم

کے ماتحت مفہوم کلام الٰہی کا سراغ لگایا جائے۔ اور قرآن حکیم کو اصل قرار دیتے ہوئے تاریخی شواہد کے لئے اگر اسفار یہود سے بھی مدد لی جائے تو چنداں مضائقہ نہیں۔ بہر حال ان سب میں مقدم ترین اصول تحصیل زبان عربی کے ساتھ ساتھ تزکیۂ نفس اور تدبر و تفکر آیات انفس و آفاق ہے جس کے بغیر نحو و بلاغت قرآن اور روح و اسرار کلام الٰہی سمجھنا دشوار ہے۔

سلسلہ خلافِ امید دراز ہو گیا اور بات سے بات نکل آئی۔ یہاں مجھے جس چیز پر کسی قدر مفصل کلام کرنا ہے وہ سنن و آثار نبوی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ہیں۔ اگرچہ ائمہ سلف اور علمائے دور حاضر نے اس کے اصول و قوانین، نوعیت و حیثیت اور حجت دینی ہونے یا نہ ہونے پر کافی سے زیادہ بحثیں فرمائی ہیں اور داد تحقیق دی ہے جو اپنی جگہ پر براہین قاطعہ ہیں لیکن افسوس مخالفین نے سطحی معلومات سے کام لے کر عوام میں سنن و آثار نبوی سے بدظنی پیدا کر ہی دی جو تمام تر غلط فہمی و قلتِ مطالعہ پر مبنی ہے، ورنہ اصول حدیث کے مالہ و ماعلیہ کے سمجھ لینے کے بعد وہ جرأت نہیں ہو سکتی جو موجودہ عہد تحقیق میں کی جارہی ہے۔ یہ ناچیز کوئی نئی بات نہیں پیش کرے گا بلکہ اہل علم کی ان تحقیقات کو سامنے لائے گا جو معرض خفا میں ہیں تاکہ فیصلہ کرنے میں حق و باطل کی تمیز ہو سکے۔ (السعی منی والاتمام من اللہ تعالیٰ)۔

اصول حدیث یہ ایک تاریخی بات ہے کہ حضرت امام شافعی نے سب سے پہلے اصول فقہ میں ایک رسالہ لکھا اور اصول حدیث میں ابتدا قاضی ابو محمد رامہرمزی اور حاکم ابو عبداللہ نیشاپوری نے کی۔ پھر تو یہ قطرہ دریا بن گیا۔ مگر ان سب کا ماخذ قرآن کریم اور سنن و آثار نبوی ہی تھی جس کو غلطی سے آج کچھ اور ہی سمجھ لیا گیا ہے۔ سب سے بڑی خصوصیت اس فن کو یہ حاصل ہے کہ اس کے اندر اجتہاد، ظن اور تخمین کو قطعاً باریابی نہیں بلکہ یا تو مشاہدات ہیں یا مسموعات وغیرہ۔ تفصیلی بحث آگے آئے گی جس سے معلوم ہو گا کہ محدثین الفاظ جرح و تعدیل جو کچھ بیان فرماتے ہیں سب کی بنیاد محسوس مشاہدہ اور کسی نصی امر پر ہے نہ کہ رائے و قیاس پر۔ ثبوت میں ذیل کے شواہد کو بغور ملاحظہ کیا جائے کہ یہی اصول حدیث کی

اساس اور بنیاد ہیں۔

(۱) یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْا الخ

لفظ فسق باصطلاح قرآن متعدد معنوں میں مستعمل ہے۔ آیات ذیل پر غور کیا جائے: اَفَمَنْ کَانَ مُؤْمِنًا کَمَنْ کَانَ فَاسِقًا۔ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّہٖ۔ فَفَسَقُوْا فِیْھَا۔ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ الْفَاسِقِیْنَ۔ وَلَا تَقْبَلُوْا لَھُمْ شَھَادَۃً اَبَدًا وَّاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَاسِقُوْنَ۔ اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّہٗ فُسُوْقٌ بِکُمْ۔ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ۔

احادیث میں بھی یہ لفظ آیا ہے۔ سباب المؤمن فسوق۔ اقتلوا الفویسقۃ۔ لا یرمی رجل رجلا بالفسق او الکفر۔ اہل عرب کا قول ہے "فسق الرطب اذا خرج عن قشرہٖ" یعنی خرمے کا چھلکے سے علٰحدہ ہوجانا چنانچہ ابن الاعرابی کہتا ہے کہ "فاسق کا لفظ انسان کی صفت میں کلام عرب میں نہیں پایا جاتا ہے"۔ بہر حال ارباب لغت وغیرہ نے "فسق فلان خرج عن حجر الشرع" "الترک لامر اللہ" "الخروج عن طریق الحق" "من بستر نعمۃ اللہ فقد خرج عن طاعتہ" وغیرہ کے الفاظ جو استعمال فرمائے ہیں اس کی اصلیت کلام عرب اور لفظ کے اصلی معنی سے ماخوذ ہے۔ رہ گیا مفہوم آیت اِنْ جَآءَکُمْ الخ سو وہ یہ ہے کہ اکثر نزاعات ومناقشات کی ابتدا جھوٹی خبروں سے ہوتی ہے اس لئے اول اختلاف وتفریق کے اسی سرچشمہ کو بند کرنے کی تعلیم دی یعنی کسی خبر کو یوں ہی بے تحقیق قبول نہ کرنا چاہئے۔ امام مسلم نے اپنے مقدمہ میں اس آیت کو بھی ذکر فرما کر یہ عبارت تحریر فرمائی ہے: فدل بما ذکرنا من ھذہ الای ان خبر الفاسق ساقط غیر مقبول وان شھادۃ غیر العدل مردودۃ۔ مفہوم واضح ہے۔ مگر حافظ ابن تیمیہ رح کی تقریر ذیل پڑھ کر تھوڑی سی الجھن بڑھ گئی "نبأ الفاسق لیس بمردود

...... وانما امر بالتبيين عند خبر الفاسق الواحد ولم يامر به عند خبر الفاسقين وذالك ان خبر الاثنين يوجب من الاعتقاد مالا يوجب خبر الواحد الخ (توجیہ النظر صفحہ ۲۹)

بظاہر یہ تقریر قدماء محدثین کے خلاف ہے۔ غالباً اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ آیت اِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ الخ کی تاویل علامہ موصوف کے نزدیک اور ہے اور محدثین کے نزدیک اور۔ خیر امام ابن تیمیہؒ کا جو بھی منشا ہو میرے نزدیک صحیح توجیہ یہ ہے کہ خبر فاسق نقل روایت حدیث میں سرے سے غیر مقبول ہی چاہے سامع کے دل میں اس کی صداقت پیدا ہو یا نہ ہو۔ وجہ یہ ہے کہ خبر تو محض ترجیح صدق ہی کی بنا پر حجت ہوتی ہے بخلاف فسق کے کہ اس سے ترجیح صدق کا قلع قمع ہو جاتا ہے اور کذب ہی کا پہلو راجح قرار پاتا ہے۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ جب عقل اور دین نے اس کو ارتکاب گناہ سے باز نہیں رکھا تو پھر جھوٹ سے کیسے بچ سکتا ہے۔ بدیں وجہ فاسق کی خبر قطعاً حجت نہ ہونی چاہئے۔ ہاں اگر وہ حلت وحرمت طعام یا پانی کی نجاست وعدم نجاست کی خبر دے تو اس وقت قبول ہوگی جبکہ اس کی تائید زبردست رائے سے ہوتی ہو۔ وجہ یہ ہے کہ کہ حلت وحرمت، نجاست وطہارت ایک امر خاص ہے بمقابل روایت حدیث کے، کیونکہ خبر کے متعلق بسا اوقات ایسی دشواریاں لاحق ہوتی ہیں کہ اس پر وقوف واطلاع پانا متعذر ہوتا ہے۔ اسی لئے جب تک دوسرے قرائن اور شواہد سے تائید نہ ہو قبول نہیں کی جا سکتی وغیرہ وغیرہ۔ اور روایت حدیث میں اس کی ضرورت نہیں کیونکہ یہاں تو عادل اور ثقہ نے تلقی اور نقل اخبار ایسے لوگوں سے کی ہے جن کو معرفت حدیث پر سماعاً پوری اطلاع حاصل ہے لہذا ان کو فاسق کی خبر پر اعتماد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس تقریر سے یہ واضح ہو گیا کہ عام خبریں اور شہادتیں دوسری چیز ہیں اور روایت حدیث امر دیگر۔ لہذا علامہ موصوف کی تقریر کو ان امور اور اخبار پر محمول کیا جائے گا جن کا روایت حدیث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

روایت اور شہادت کا فرق | اس موقع پر روایت اور شہادت کے فرق کو سمجھ لینا چاہئے جس سے صدہا مشکلات

کا حل ہوجاتا ہے اور جس میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے بہتوں نے ٹھوکریں کھائی ہیں۔ علامہ سیوطیؒ نے تدریب میں مفصلاً اور حافظ ابن قیمؒ نے بدائع الفوائد میں مجملاً بحثیں کرکے شہادت اور روایت کے فرق کو واضح کیا ہے۔ اصل کتاب کی جانب رجوع کرنا چاہئیے۔ مباحث علم حدیث کے سمجھنے کے لئے چند اصولی فروق کو یہاں لکھا جاتا ہے:۔

روایت نام ہے عام لوگوں کو خبر دینے کا کہ جس کا مرافعہ حکام کی طرف نہ کیا جاسکے۔ بخلاف شہادت کے کہ اس میں یہ بات نہیں ہوتی اور اسی بناپر احکامات میں آگے چل کر اختلاف ہوجاتا ہے۔ اسی طرح روایت میں عدد شرط نہیں ہے اور شہادت میں یہ بحث پیدا ہوتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سواد امت آنحضرت صلعم پر کبھی جھوٹ کی نسبت نہیں کرسکتی کیونکہ اسے ہر طرح کا خوف اور خطرہ ہے جو دارین کی ہلاکت اور تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ بخلاف شہادت کے کہ دن دھاڑے جھوٹی گواہی لوگ دیتے رہتے ہیں[۱]۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ کبھی راوی منفرد ہوتا ہے۔ اگر ایسی حالت میں روایت قبول نہ کی جائے تو اہل اسلام کی صدہا مصلحتیں فوت ہوجائیں بمقابل اس بات کے کہ ایک شخص کا حق ایک شخص کی وجہ سے ضائع ہوجائے تو چنداں مضائقہ نہیں۔ نیز یہ وجہ بھی ہے کہ لوگوں میں باہم عداوتوں کی بناپر جھوٹی گواہی دینے کا جذبہ پیدا ہوتا رہتا ہے نہ کہ آنحضرت صلعم سے جھوٹ روایت کرنا وغیرہ۔ روایت میں ذکوریت شرط نہیں ہے بخلاف شہادت کے کہ اس میں

[۱] ترجمان القرآن۔ یہ حجت محل نظر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ امت کا سواد اعظم نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بہتان باندھنے کا خیال بھی نہیں کرسکتا، مگر افراد امت نے ایسا کیا ہے اور امت نے اکثر دھوکا بھی کھایا ہے۔ اعداء دین نے تو خیر قصداً شرارت کی نیت سے حدیثیں گھڑیں، مگر کیا واعظوں اور زاہدوں نے موضوعات او ضعاف کو تکیہ کلام نہیں بنایا؟ اور کیا ان حضرات کے اعتماد پر غیر معتبر روایتیں عامۃ الناس کے زبان زد نہیں ہوئیں؟ اسی بناپر تو محدثین نے روایات کی چھان بین میں اس سے زیادہ سختی کی ہے جس قدر قانون شہادت کی رو سے قاضی کرتا ہے۔ اور اسی بناپر اخبار احاد کا حدیث میں وہ درجہ نہیں جو مشہورات کا ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ خبر واحد کو محض خبر واحد ہونے کی وجہ سے رد نہیں کردیا گیا، بلکہ راویوں کے احوال اور سلسلہ اسناد کی کیفیت کو دیکھ کر رائے قائم کی گئی ہے جو سراسر معقول ہے۔

بعض مواقع میں ذکوریت شرط ہے۔ اسی طرح جھوٹ سے توبہ کرنے والے کی شہادت مقبول ہے لیکن روایت غیر مقبول۔ اگر کوئی ایک روایت میں جھوٹا ثابت ہوگیا تو اس کی جمیع روایات غیر مقبول ہو جاتی ہیں۔ بخلاف شہادت کے کہ اگر ایک مرتبہ جھوٹی معلوم ہوجائے تو اس سے پہلے کی شہادتیں رد نہیں کی جائیں۔ اہل علم پر مخفی نہیں کہ صحیح مذہب کی بنا پر تنہا ایک شخص کی جرح وتعدیل روایت میں معتبر ہو جاتی ہے نہ کہ شہادت اور گواہی۔ غور کرو اگر کسی نے روایت کی اور پھر اس سے رجوع کر لیا تو روایت اور عمل دونوں ساقط ہوجائیں گے۔ شہادت میں یہ بات نہیں ہوتی ہے۔ یہاں تو حکم کے بعد رجوع کر ہی نہیں کرسکتا۔ اس فرق کو سمجھو تاکہ فن حدیث کی اہمیت کا اندازہ ہو اور آنے والے مباحث کے پیچ وخم ایک ایک کرکے واضح ہوجائیں۔

(۲) یَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ۔ وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ۔ لفظ عدل کی لغوی تحقیق طویل ہے۔ قرآن حکیم میں یہ لفظ مختلف مقامات پر بیان ہوا ہے۔ سورۂ مائدہ کی ایک آیت میں یہ لفظ دو جگہ موجود ہے۔ یَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا الخ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عبادات ہوں خواہ معاملات، اخلاقیات ہوں خواہ سیاسیات، مذہب سب کا ضامن اور قرآن مہیمن ہے۔ قرآن کریم کا یہ حکم ہے کہ تم میں سے وہ لوگ ایسے امور میں فیصلہ کریں جو صاحب بصیرت، معتبر، اور تجربہ کار ہوں کیونکہ یہ چیزیں ایسی ہیں جن سے ایک شخص کے کیرکٹر کی بلندی، صداقت اور اس کے عادل ہونے کی شہادت دی جاسکتی ہے، جو عند اللہ معتبر ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ عند الناس معتبر نہ ہو۔ ہاں بعضوں کو یہ طالب علمانہ شبہہ ہوسکتا ہے کہ "متقی اور عادل وغیرہ ہونا اوصاف باطنی ہیں، اس کی تمیز کس چیز پر رکھی جائے؟ رہا ظاہری تقویٰ وطہارت تو اس کی بابت خود محدثین کو تلخ تجربہ ہے"۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آیات بالا کے عموم سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ظاہر پر حکم نہ دینا اور باطن پر معلق رکھنا تکلیف مالا یطاق ہے۔ لَا یُکَلِّفُ

اللهُ نَفْساً اِلَّا وُسْعَهَا۔ پھر کیا یہ حکم مصلحت وحکمت خداوندی کے خلاف نہیں ہے؟ خدا تو حکم دیتا ہے کہ تم میں سے دو عادل شخص اس پر حکم لگائیں۔ اب کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ عدالت کا علم نہیں ہو سکتا لہٰذا خدا کا یہ حکم نعوذ باللہ بے معنی اور لائق اعتماد نہیں ہے؟ کیا آیات مذکور میں محض تصرف باطنی کا حکم ہے یا محض ظاہر بینی کا؟ خوب غور کر لیا جائے تاکہ یَحْکُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ کا مفہوم واضح ہو جائے۔ بخاری میں ہے "عن عبد الله بن عمر عن سعد بن وقاص عن النبی صلعم انه مسح علی الخفين وان عبد الله بن عمر سأل عمر عن ذلك فقال نعم اذا حدثك شيئاً سعد عن النبی صلعم فلا تسأل عنه غيره" نیز بیہقی نے مدخل میں حضرت عبد اللہ بن عباس سے مرفوعاً اور موقوفاً روایت کیا ہے "لا تاخذ والعلم الا ممن تقبلون شهادته" وروی ایضا من طریق الشعبی عن ابن عمر عن عمرؓ قال كان يامرنا ان لا ناخذ الا عن ثقة۔

لفظ ثقہ کوئی غیر مانوس لفظ نہیں ہے، بلکہ اس کی اصل کلام عرب میں پائی جاتی ہے۔ زہیر کہتا ہے:-

اخی ثقة لا يهلك الخمر ماله ولكنه قد يهلك المال نائله

اس کی جمع ثقات وغیرہ آتی ہے یعنی قابل اعتبار، دیانت دار، او معتبر لوگ۔ لہٰذا سمجھ لینا چاہیئے کہ محدثین کرام جب اس لفظ کو بولتے ہیں تو تنہا یہ لفظ قبول روایت کے لئے کافی ہوتا ہے۔ اور یہ ایک ایسا وصف ہے کہ دنیا میں خبروں کے رد و قبول کے لئے ہر جگہ مسلم ہے، اسی وصف کو ہر شخص ہر خبر دینے والے میں دیکھتا ہے اور عرفاً اس کے مفہوم کو بھی جانتا ہے۔ مگر کسی قوم نے مسلمانوں سے بڑھ کر اس کا عملاً لحاظ نہیں کیا چنانچہ علامہ ابن حزم بالکل صحیح فرماتے ہیں:-

"نقل الثقة عن الثقة حتى تبلغ به النبی صلعم مع الاتصال خص الله به المسلمين دون سائر الملل"[۱]

خلاصہ یہ ہے کہ محدثین جب لفظ عدالت بولتے ہیں تو اس کے متداول معنی مراد نہیں ہوتے بلکہ صرف

[۱] تدریب

عدالت فی روایت الحدیث مراد ہوتی ہے۔ اور اس عدالت کی حقیقت روایات میں اجتناب عن الکذب ہے شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ راویوں کو سچا سمجھنا تو خود محدثین کی رائے ہے جو محض ظنی اور اجتہادی چیز ہے۔ سو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ شخص عادل وضابط کے بیان پر وثوق کرنا اور سچا سمجھنا تو نصی اور اتفاقی مسئلہ ہے صرف اہل اسلام کا نہیں بلکہ تمام دنیا کا۔ گواہ عادل کی گواہی پر حکم لگانا، نصی اور اتفاقی بات ہے۔

نصوص ذیل پر ایک اجمالی نظر

(۳) یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَتَبَیَّنُوْا، (۴) لِمَنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّھَدَآءِ، (۵) لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْہُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِھِمْ خَیْرًا وَّقَالُوْا ھٰذَآ اِفْکٌ مُّبِیْنٌ، (۶) وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْہُ قُلْتُمْ مَّا یَکُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَکَلَّمَ بِھٰذَا سُبْحٰنَکَ ھٰذَا بُھْتَانٌ عَظِیْمٌ (۷) لَعْنَتُ اللّٰہِ عَلَی الْکٰذِبِیْنَ (۸) لَقَدْ کَانَ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ (۹) وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَھُمُ الْجٰھِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا، (۱۰) کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع، (۱۱) من کذب علی متعمدا فلیتبوء مقعدہ من النار الخ (۱۲) نضر اللہ امرأ سمع مقالتی فوعاھا واداھا، (۱۳) من رغب عن سنتی فلیس منی (۱۴) لیبلغ الشاھد الغائب، (۱۵) ارجعوا الی اھلیکم فعلموھم، (۱۶) صلوا کما رأیتمونی اصلی، (۱۷) بلغوا عنی ولو آیۃ وحدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج، (۱۸) من حدث عنی بحدیث یری انہ کذب فھو احد الکاذبین۔

ان نصوص پر غور کرنے اور ان کے صریح اور لطیف اشارات کو مدنظر رکھنے سے مندرجہ ذیل باتیں بادنیٰ تامل سامنے آجاتی ہیں،

(۱) قرآن حکیم کے حکم وَذَکِّرْھُمْ بِاَیّٰمِ اللّٰہِ وغیرہ آیات نے مسلمانوں کو فن حدیث کی طرف متوجہ کیا اور لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ نے آتش بر روغن کا کام دیا۔

(۲) نصوص بالاہی نے مجبور کیا کہ سنن و آثار نبوی کی تحفظ کے لئے اصول و قوانین مرتب و منظم شکل میں پیش کئے جائیں جو ذریعہ ہوں آنحضرت صلعم کے اقوال و افعال کے تحفظ کا۔

(۳) قانون تنقید کی ایجاد، احکامات اور فضائل و ہدایات جن کو آنحضرت صلعم نے وقتاً فوقتاً ارشاد فرمایا تھا اور جو درحقیقت انہیں نصوص بالا کی تفسیریں ہیں، ان کو بقا اور دوام حاصل ہونا۔

(۴) آنحضرت صلعم کے ساتھ صحابہ کی محبت، ان کا اخلاص اور جوش فدویت و شغف جس نے اصحاب رسول اللہ صلعم کو آنحضرت صلعم کی ہر ادا کا شیدا بنا دیا تھا۔ اس لئے ضرورت داعی ہوئی کہ مستقل قوانین و اصول کے ماتحت آئندہ تحریف اور تصحیف سے آپ کے ارشادات کو پاک رکھا جائے۔

(۵) محدثین نے رواۃ کی نسبت جو کچھ الفاظ جرح و تعدیل بیان فرمائے ہیں تمام کی بنا حس اور مشاہدہ ہے نہ کہ رائے و قیاس۔ بلکہ زیادہ تر تجربیات ہیں۔ قرآن نے خود تجربہ کے لئے امارات بتائے، چنانچہ آیت[9] میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز حسی اور مشاہدات سے ہے۔ غرض جو کچھ ثقاہت و عدالت کی نشانیاں قرآن میں بتائی گئی ہیں یا احادیث میں وارد ہوئی ہیں وہ سب حسی اور مشاہدات سے ہیں۔ پس ان امارات او علامات سے ثقاہت و عدالت ثابت ہوجاتی ہے۔ کیونکہ یہ نصی امر ہے۔ ان امارات ثقاہت و عدالت کے ساتھ عدم ظہور فسق اور غیر متہم ہونا ان امارات کا موثق اور مصدق ہے۔ راوی اور مروی عنہ کی معاصرت، اُن کا آپس میں لقا، سماع، یہ سب امور مسموعات یا مشاہدات سے ہیں۔ دو شخصوں کی معاصرت یا آپس کے ملنے جلنے اور سماع کو شخص حاضر دیت و مشاہدہ سے جانتا ہے۔ غائب حاضر کی شہادت سے جان سکتا ہے۔ رواۃ کا ثقہ ہونا حاضرین کو ملاقات اور تجربہ سے معلوم ہوتا ہے اور غائبین کو اُن کی شہادت اور اُن کے درمیان شہرت سے۔ پس کسی محدث کا کسی حدیث کو صحیح یا ضعیف یا موضوع وغیرہ کہنا مسائل اجتہادیہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ فقیہ اپنی رائے و قیاس پر خود ایسا اعتماد نہیں رکھتا کہ حتمی حکم لگائے اور عمل کرنا واجب قرار دے۔ بخلاف محدثین کے کہ وہاں روایت کے صحیح ثابت ہوجانے پر عمل کرنا واجب ہوجاتا ہے "انھم اتفقوا علی وجوب

العمل بکل ما صح" یعنی تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ جو حدیث آنحضرت صلعم سے صحت کو پہنچ جائے گی اس پر عمل واجب ہوگا۔

یہ ایک اجمالی نقشہ تھا جو پیش کیا گیا۔ اصحاب رسول اللہ صلعم نے انہیں نصوص سے اصول حدیث اور قواعد روایت استنباط فرمائے۔ احادیث کی تحقیق و تنقید اور فن جرح و تعدیل کی ایجاد خود حضرت عمر فاروق رضؓ نے کی ہے۔

واقعات ذیل پر غور کیا جائے:۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضؓ ایک مرتبہ آپ سے ملنے آئے اور تین دفعہ استیذان کے قاعدہ پر السلام علیکم فرمایا حضرت عمر رضؓ اس وقت کسی کام میں مصروف تھے اس لئے متوجہ نہ ہوئے۔ کام سے فارغ ہو چکنے کے بعد فرمایا کہ ابو موسیٰ کہاں ہیں؟ وہ آئے تو فرمایا کہ کیوں واپس گئے؟ ابو موسیٰ رضؓ نے کہا میں نے رسول اللہ صلعم سے سنا ہے کہ تین مرتبہ اذن مانگو، اگر اس پر بھی اجازت نہ ملے تو واپس جاؤ۔ حضرت عمر رضؓ نے فرمایا اس روایت کا ثبوت دو ورنہ میں سزا دوں گا۔ ابو موسیٰ اشعری رضؓ گھبرائے ہوئے صحابہ کے پاس گئے اور نفس واقعہ بیان کیا۔ حضرت ابو سعید خدری رضؓ نے آکر تصدیق کی کہ میں نے آنحضرت صلعم سے یہ حدیث سنی ہے۔ ابی بن کعب نے فرمایا عمر تم رسول اللہ صلعم کے اصحاب کو عذاب دینا چاہتے ہو؟ فرمایا میں نے ایک روایت سنی اور اس کی تصدیق کرنی چاہی۔ چنانچہ جب سقط کا مسئلہ پیش آیا تو حضرت عمر رضؓ نے صحابہ سے مشورہ طلب کیا مغیرہ بن شعبہ رضؓ نے اس کے متعلق ایک حدیث روایت کی۔ حضرت عمر رضؓ نے فرمایا کہ تم سچے ہو تو اور کوئی گواہ لاؤ۔ جب محمد بن مسلمہ نے تصدیق کی تب حضرت عمر رضؓ نے تسلیم کیا۔ اسی طرح حضرت عباس رضؓ کے مقدمہ میں ایک حدیث پیش کی گئی تو حضرت عمر رضؓ نے تائیدی شہادت طلب کی۔ لوگوں نے شہادت دی۔ حضرت عمر رضؓ نے فرمایا مجھ کو تمہاری نسبت بدگمانی نہ تھی لیکن میں نے حدیث کے متعلق اطمینان کرنا چاہا۔ غرضیکہ حضرات خلفائے اربعہ نے اسی اصول کے ماتحت ضرورت کے وقت صحابہ سے استفسار فرما کر احادیث و فیصلۂ نبوی کی

جستجو و تحقیق فرمائی۔ یہ اور اس طرح کے کتنے واقعات ہیں جن سے روایات کے رد و قبول پر روشنی پڑتی ہے۔
لیکن افسوس ہے کہ لوگوں نے ان واقعات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مخلوق الٰہی کو سنن و آثار نبوی سے بدظن کر دینے کی کوشش کی ہے، حالانکہ انھیں اگر تحقیق مدنظر ہے تو اس کا موقع قیامت تک ہے۔ کر دیں۔ لیکن تصویر کے ہر رخ پر نظر رکھتے ہوئے قدم اٹھائیں اور جس طرح اپنے مدعا کے ثبوت میں کتب طبقات و رجال وغیرہ سے دلائل پیش کرتے ہیں خدارا اسی جگہ دوسرے رخ کو بھی ملاحظہ فرمالیں۔ یہ عیب کی بات ہے کہ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ پر عمل کیا جائے اور اس کا نام تحقیق و اجتہاد رکھا جائے اس طرح کے جملہ شکوک و شبہات پر مفصل بحثیں تذکرۃ الحفاظ، فتح الباری، اور جامع بیان العلم وفضلہ لابن عبدالبر، و تاویل مختلف الحدیث وغیرہ میں پوری دیانت اور ایمانداری کے ساتھ موجود ہیں جن کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ ستم تو یہ ہے کہ حضرات شیخین رض پر یہ اتہام لگایا جاتا ہے کہ روایت حدیث کے مخالف تھے لیکن انہیں کیا معلوم کہ خود حضرت ابوبکر رض سے (۱۴۲) اور حضرت عمر رض سے (۵۳۷) احادیث مروی ہیں [۱] نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے تو خلیفہ اول رض کی مرویات کو آٹھ سو بیان فرمایا ہے۔ [۲]

اصحاب رسول اللہ صلعم کو اپنی ذمہ داری اور رسول اللہ صلعم پر غلط گوئی سے بچنے کی اس درجہ احتیاط تھی کہ جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ صرف حضرت عبداللہ بن مسعود رض کے اس واقعہ کو سامنے رکھئے۔ عمر بن شیبانی کہتے ہیں کہ میں ابن مسعود رض کے پاس بیٹھا کرتا تھا وہ قال رسول اللہ کبھی نہیں کہتے تھے اور جب قال رسول اللہ کہتے تھے تو مارے ڈر کے کانپنے لگتے تھے اور کہتے تھے کہ رسول اللہ نے اس طرح فرمایا یا ایسا ہی فرمایا یا تقریباً ایسا ہی فرمایا، یا۔ یا۔ یا۔ اس کامل احتیاط کے باوجود آپ سے (۸۴۸) احادیث مروی ہیں [۳]
حضرت عبداللہ بن مسعود رض اپنے تلامذہ کو تاکید فرماتے کہ روایت حدیث میں کسی طرح بے احتیاطی نہ ہونے پائے۔ علماء نے لکھا ہے، "یتشدد فی الروایۃ ویزجر تلامذتہ عن التھاون فی ضبط

[۱] تلقیح فھوم الاثر [۲] تقصار جیود الاحرار صفحہ ۷ [۳] تلقیح فھوم الاثر۔

الالفاظ" چنانچہ اسی احتیاط کی بنا پر ایک صحابی دوسرے صحابی کو غلط فہمی کے سوا کذب کا مصداق نہیں ٹھہراتا تھا۔ تاہم عامہ صحابہ کا خوف یکساں نہ تھا اور نہ سب کی طبیعت یکساں ہونی ممکن ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم سیرۃ رسول سے بالکل محروم رہ جاتے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کا واقعہ بخاری میں موجود ہے فرماتے ہیں، لو وضعتم الصمصامۃ علی ھذا واشار الی قفاہ ثم ظننت انی انفذ کلمۃ سمعتھا من النبی صلعم قبل ان تجیزوا علی لانفذتھا" یہ ہیں وہ واقعات جن کی روشنی میں اصول حدیث کی اہمیت اور ناقابل تردید جدوجہد کا سراغ ملتا ہے کہ یہ فن کس قدر اپنے اندر صحیح اور عقلی حقائق و معارف رکھتا ہے۔ (باقی)

تنزیل و تاویل

امثال القرآن

از جناب مولوی محمد ایوب صاحب جیراجپوری

[قرآنی مباحث میں امثال کی جو اہمیت ہے اس کا اندازہ قرآن کے ہر طالب علم کو ہوگا۔ یہ مثلیں اپنے اندر بے شمار اسرار اور حقائق کا خزانہ رکھتی ہیں، جن کے سمجھنے کے بعد قرآنی اعجاز بلاغت کا کمال معلوم ہو سکتا ہے۔ علامہ ابن قیمؒ کا نام قرآنی بصیرت رکھنے والوں میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ موصوف کی مجتہدانہ ژرف نگاہی اور قرآن فہمی کسی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اپنی تصنیف اعلام الموقعین میں انھوں نے ایک مفید بحث خاص امثال القرآن کے متعلق فرمائی ہے۔ عام استفادہ کی خاطر اس کا آزاد ترجمہ ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں (ایوب جیراجپوری)]

تمثیل کی غرض یہ ہوتی ہے کہ کسی غیر واضح اور غیر محسوس حقیقت کو مخاطب کے فہم سے قریب تر لانے کیلئے کسی ایسی چیز سے تشبیہ دی جائے جو واضح اور محسوس ہو۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھو کہ جو چیز عام نگاہوں سے اوجھل ہوتی ہے تمثیل کے ذریعہ سے گویا اس کا مشاہدہ کرا دیا جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں یہ طرز بیان بڑی کثرت کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے کیونکہ جن حقائق سے وہ آگاہ کرنا چاہتا ہے وہ قریب قریب سب کے سب غیر مرئی و غیر محسوس

ہیں۔ لہذا قرآن مجید کی تمثیلات کا مضمون بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس میں تدبر کرنا مطالب قرآن کو سمجھنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔

(۱) قرآن منافقین کے بارے میں کہتا ہے:۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا
فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ
وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ۝ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ
فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ۝ أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ فِيهِ
ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ
فِي آذَانِهِمْ مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ
وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ۝ يَكَادُ الْبَرْقُ
يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا
فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا وَلَوْ شَاءَ
اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ إِنَّ
اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ (بقرہ - ۲)

ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی، پھر جب اسکے آس پاس کی چیزیں چمک اٹھیں تو اللہ نے ان کا نور سلب کر لیا اور ان کو تاریکیوں میں چھوڑ دیا کہ ان کو کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ بہرے گونگے اندھے ہیں کہ وہ پھر (راہ راست پر) نہیں آسکتے یا مثلاً آسمانی بارش آئی جس میں تاریکیاں ہیں اور گرج اور بجلی کی کڑک کا یہ حال ہے کہ وہ جان کے خوف سے کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں اور چمک کا یہ زور ہے کہ آنکھیں اندھی ہوئی جاتی ہیں۔ اور کافروں کو چاروں طرف سے اللہ نے گھیر رکھا ہے۔ جب جب انکے آگے بجلی چمکی وہ اس کی روشنی میں کچھ دور چل لیے اور جب ان پر تاریکی چھا گئی تو کھڑے (کے کھڑے) رہ گئے۔ اور اگر اللہ چاہے تو ان کی سننے اور دیکھنے کی قوتیں سلب کرے بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے منافقین کے حسب حال دو مثلیں بیان کی ہیں۔ ایک ناری دوسری آبی۔ غور کرو تو معلوم ہوگا کہ اس میں فلسفۂ ہدایت کی گہری حکمت پنہاں ہے۔ یہی دونوں چیزیں (آگ اور پانی) روشنی اور زندگی کا سرچشمہ ہیں۔ آگ روشنی کی اصل ہے اور پانی زندگی کی اصل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی وحی کے متعلق فرماتا ہے کہ اس کے اندر دلوں کے لئے زندگی اور نور ہے۔ اسی مناسبت سے اس کا نام اس نے روح

اور نور رکھا ہے۔ اسے قبول کرنے والوں کو "احیاء" (زندہ) کہتا ہے جو روشنی میں ہیں، اور منکرین کو "اموات" (مردہ) بتاتا ہے جو تاریکی کی وادیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ یہاں منافقین کی حالت اس مناسبت سے بیان کی ہے کہ انھوں نے وحی الٰہی کو دلیل راہ بنایا لیکن اپنی ہی خریدی ہوئی بدبختیوں کی بدولت اس پر قائم نہ رہ سکے اسی لئے ان کو اس شخص کے مشابہ قرار دیا ہے جس نے آگ جلائی روشنی حاصل کرنے اور بہرہ مند ہونے کے لئے لیکن اس کی یہ کوشش نتیجہ خیز نہ ہوئی۔ منافقین کی حالت اس سے بالکل ملتی جلتی ہے بایں طور کہ انھوں نے دائرۂ اسلام میں قدم رکھا، اس کی روشنی میں چلنا چاہا، فوائد حاصل کئے، اس کے دامن میں پناہ لی اور مسلمانوں میں مل گئے لیکن چونکہ اس میل ملاپ کا محرک کوئی ایمانی جذبہ نہ تھا جس کا نور ان کے دلوں میں واقعۃً موجود ہوتا اس لئے اللہ نے اسلام کی یہ روشنی ان کے دلوں سے بجھادی اور ان پر ظلمت و تاریکی کا پردہ ڈال دیا۔ ذرا قرآن کی اس حکمت پر بھی ایک نظر ڈالو کہ اس نے "ذَھَبَ اللّٰہُ بِنُوْرِھِمْ" (ان کی روشنی زائل کردی) کہا ہے "بنارھم" یعنی ان کی آگ بجھادی نہیں کہا۔ آگ کی خاصیت روشنی بخشنا اور جلانا دونوں ہے سو اللہ نے روشنی تو ان سے سلب کرلی اور جلانے کی تاثیر باقی رکھی اور ان کو تاریکیوں میں بھٹکتا چھوڑ دیا۔ یہی اس شخص کی صحیح تصویر ہے جس نے بینائی سے کام لیا پھر آنکھوں پر خود ہی پٹی باندھ لی۔ معرفت و ہدایت کی سعادت حاصل کی پھر خود ہی انکار و تکذیب کی لعنت اوڑھ لی۔ حدودِ اسلام میں داخل ہوا پھر باطنی لحاظ سے آپ ہی آپ الٹے پاؤں پھر گیا اور ادھر کا رخ نہ کیا۔ اسی وجہ سے ان کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ "وہ اب لوٹنے والے نہیں"۔

اب ذرا قرآن کی آبی تمثیل کے آئینہ میں بھی منافقین کی تصویر دیکھ لو۔ قرآن کہتا ہے کہ منافقین کی مثال ان لوگوں کی سی ہے جو چلتے چلتے زور شور کی بارش میں گھر گئے ہوں۔ بادلوں کی ہمہ گیر تاریکی ان پر مسلط ہے۔ ہولناک بجلیوں کی کڑک چمک ہے۔ ضعف قلب اور سراسیمگی سے ان کا برا حال ہے۔ تاریکی میں کبھی کبھی رہ رہ کر بجلی چمکتی ہے تو اس کی مدد سے دو قدم چل لیتے ہیں لیکن جب زور کی بجلی

کڑکتی اور کوندتی ہے تو ڈر کے مارے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں اور آنکھیں بند کر لیتے ہیں کہ کہیں صاعقۂ آسمانی آنہ لے اور تارِ حیات ٹوٹ نہ جائے۔ بس اسی طرح ان منافقین کے لئے بھی رحمتِ الٰہی کی وہ بارش جو قرآن کی صورت میں ہوئی، ان کی اپنی کمیِ عقل ضعفِ دماغ اور قلتِ علم و بصیرت کی وجہ سے زحمت بن گئی۔ قرآن کے احکام امر و نہی، اس کی دعوتِ جہاد و قتال، اور نفس پرستوں پر اس کی زجر و توبیخ ان کے لئے بجلی کی کڑک اور چمک بن گئے جن کی تاب لانا ان کے بس میں نہ تھا۔ ہلکی ہلکی بےضرر تعلیمات کی روشنی میں تو وہ کچھ چل لیتے ہیں۔ مگر جہاں آزمائش کے معاملات آجائیں، یا جہاں تاویلات کی گنجائش نہ دے کر دو ٹوک فیصلہ کر دینے والی آیت آجائے وہاں وہ سخت کشمکش اور پریشانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ ہمارا روز کا مشاہدہ ہے کہ جب گمراہ اور بدعتی فرقوں کے سامنے قرآن کی کوئی صریح آیت پیش کر دی جاتی ہے تو وہ ایسے سٹ پٹاتے ہیں کہ گویا بکریوں کے سامنے شیر آگیا، حالانکہ قرآن کی آیات تو فی نفسہٖ رحمت ہے، مگر ان کے لئے سخت مصیبت بن جاتی ہے۔ اس کی چکا چوند میں وہ الٹا اور راستہ بھول جاتے ہیں اور اس کی آواز ان کے لئے بجلی کا کڑکا بن جاتی ہے جس سے جان بچانے کے لئے انہیں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لینی پڑتی ہیں۔ ان کی یہ حالت کیوں ہوتی ہے؟ صرف اس بنا پر کہ ان کی عقلوں اور دلوں پر حق سے نامانوسیت اور بیگانگت کا پردہ پڑا ہوا ہے اور ان کے کمزور دل صفاتِ الٰہی کے روحانی بار کو اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس وجہ سے وہ اعراض و نفرت پر تل جاتے ہیں۔ انہیں کے مثل ان مشرکوں کا (خواہ ان کے مختلف گروہ اپنے مشرکانہ خیالات میں کتنے ہی مختلف ہوں) حال بھی ہے جن کے سامنے خالص مسئلہ توحید مبرہن ہو کر آجاتا ہے اور قطعی دلائل و نصوص ان کے مشرکانہ اوہام کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیتے ہیں تب بھی ان کے دلوں میں ایمان کی روشنی پیدا نہیں ہوتی، بلکہ ان پر قرآن کی یہ آیات اتنی شاق گزرتی ہے اور وہ اس سے اس قدر وحشت کھاتے ہیں کہ اگر ان کا بس چلے تو اپنے کانوں کو بند کرنے میں بھی دریغ نہ کریں۔ اسی طرح اگر تم اصحابؓ سرورِ کونین صلعم سے

بھی دشمنی رکھنے والوں کو دیکھو گے تو انہیں بھی اسی مرض میں گرفتار پاؤ گے۔ جب خلفائے راشدین اور صحابہ کی حقانیت اور بزرگی ثابت کرنے والی صریح نصوص ان کے سامنے بے نقاب ہو کر آتی ہیں تو اُن سے بڑھ کر کوئی چیز ان کیلئے سوہانِ روح نہیں ہوتی اور نہایت بے باکی کے ساتھ وہ ان حقائق کا انکار کر دیتے ہیں۔ غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ان تمام مرضائے قلوب کو منافقین کی اس معنوی حالت سے جس کی مثال اللہ نے بیان فرمائی ہے ایک خاص مناسبت ہے۔ اس لئے کہ ان کے حالات اور اعمال بالکل انھیں کے سے ہیں اور دلوں کی مشابہت ہی اعمال کی مشابہت کی باعث ہوتی ہے۔ ایک جماعت یا ایک فرد کے افعال و کردار میں اگر ہم رنگی ہے تو جان لو کہ ان کی کیفیت نفسی اور ان کی صورت روحانی میں بھی ضروری مشابہت ہے۔

(۲) سورۂ رعد میں اسی فلسفۂ ہدایت کو دوسرے پہلو سے بیان کیا گیا ہے۔ وہاں مومنین کو سامنے رکھ کر ان کے بارے میں بھی یہی دونوں، ناری و مائی تمثیلیں بیان فرمائی گئی ہیں مگر دیکھو کہ دونوں میں کتنا بڑا فرق ہے:-

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ (رعد-۲)	اللہ نے آسمان سے پانی برسایا۔ پھر اپنی اپنی (سمائی کے) بقدر اس ندی نالے بہ نکلے۔ پھر (پانی کے) ریلے میں جھاگ بن کر اوپر اٹھ آئے۔ اسی طرح زیور یا دوسرے ساز و سامان بنانے کے لئے (معدنیات کو) جب لوگ آگ میں تپاتے ہیں تو ان میں بھی اسی طرح کا جھاگ ہوتا ہے۔ یوں اللہ حق و باطل کی مثالیں بیان فرماتا ہے۔ سو جھاگ تو رائگاں جاتا ہے اور (پانی) جو لوگوں کے کام آتا ہے زمین میں ٹھیرا رہتا ہے اللہ اسی طرح مثالیں بیان فرماتا ہے

یہاں اللہ تعالےٰ نے اپنی وحی کو جسے وہ قلب انسانی کو زندہ کرنے کے لئے اتارتا ہے پانی سے تشبیہ دی ہے جو زمین کو زندہ کرنے کے لئے برسایا جاتا ہے اور دلوں کو ندی نالوں سے تشبیہ دی ہے جس طرح ندی نالے آسمان کی بارش کو اپنی اپنی وسعت کے مطابق اپنے سینوں میں بھر لیتے ہیں اسی طرح انسانی قلوب بھی دریائے معرفت

سے بقدر ظرف لے لیتے ہیں۔ جو قلب جتنی زیادہ وسعت رکھتا ہے وہ اسی قدر علم و بصیرت کا خزانہ وحی الٰہی کے فیضان عام سے حاصل کر لیتا ہے۔ پانی کے ساتھ وحی اور ندی نالوں کے ساتھ قلوب کی تشبیہ کس قدر بلیغ ہے۔ پھر دیکھو بادلوں سے جب بارش ہوتی ہے اور زمین پر پڑ کر دھارے کی شکل میں بہنے لگتی ہے تو اس وقت زمین کی تمام غلاظتیں اور میل کچیل اور خس و خاشاک سب ابھر کر سطح آب پر آجاتے ہیں مگر چند لمحوں کے بعد کہیں ان کا نام و نشان تک نہیں رہتا، اور وہی پاک صاف پانی باقی رہ جاتا ہے جو انسان کے لئے مفید ہے۔ اسی طرح علم و بصیرت اور رشد و ہدایت کا آب حیواں بھی جب قلوب کی وادیوں میں اترتا ہے تو پہلے تمام دبی ہوئی کثافتوں کو ابھار دیتا ہے اور بالآخر نفسانی خواہشوں اور تشکوک و اوہام کی گندگیوں کو فنا کر کے دلوں کو انوار الٰہی کا مہبط بنا دیتا ہے۔ اس کی مثال بعینہٖ دوا کی سی ہے جو جسم کے اندر داخل ہو کر تمام اخلاط جسم کو ابھار دیتی ہے اور مریض ایک طرح کی ناگواری محسوس کرتا ہے حالانکہ اخلاط کا ابھرنا دوا کے فوائد میں سے ہے کیونکہ وہ انھیں ابھارتی ہی اس لئے ہے کہ فنا کر دے، جیسا کہ اس کی فطرت کا خاصہ ہے۔ ان حقائق کو سامنے رکھو اور پھر حق و باطل کی باہمی آویزش کا تصور کرو۔ حق نمودار ہوتا ہے تو دلوں میں چھپی ہوئی باطل کی تمام قوتیں سر نکال لیتی ہیں بلکہ یوں کہنا چاہئیے کہ حق خود ہی کرید کر ان قوتوں کو ابھارتا ہے تاکہ انھیں باہر نکال پھینکے۔ کچھ مدت تک تو وہ قوتیں ایک بحرانی کیفیت میں ابھری رہتی ہیں لیکن آخر کار فنا ہو جاتی ہیں اور آئینۂ قلب بالکل صاف ہو کر چمک اٹھتا ہے۔ یہ تمثیل تو مائی تھی ناری تمثیل بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے:-

وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ	اور یہ جو (لوگ) زیور یا دوسرے سازوسامان کے لئے
ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ	(معدنیات کو) آگ میں تپاتے ہیں اس میں (بھی) اسی طرح جھاگ اٹھتا ہے

معدنیات جب آگ میں پگھلائی جاتی ہیں تو ان میں سے میل کا جھاگ اٹھتا ہے۔ اصل جوہر نیچے رہ جاتا ہے جو انسانی ضروریات زندگی کے لئے کار آمد ہے اور جھاگ ویرا کر چھنٹ جاتا اور سوخت ہو جاتا ہے۔ ایمان و ہدایت کا معاملہ بھی ایسا ہی کچھ ہے۔ ایمان کی گرمی جب پہنچتی ہے تو مومن کے قلب کو اپنے اندر کی کثافتوں کا شدید احساس

ہوتا ہے اور وہ پریشان ہونے لگتا ہے۔ مگر یہ آگ شہوات اور شبہات کی گندگیوں کو اس طرح چھانٹ کر پھینک دیتی ہے جس طرح بھٹی کی آگ معدنیات کے میل اور زنگ کو۔ پھر جس طرح ملاوٹ نکل جانے اور سوخت ہو جانے کے بعد معدنیات کا خالص جوہر انسانوں کو فائدہ پہنچاتا ہے اسی طرح نور ایمان بھی قلب مومن میں متمکن ہو کر نہ صرف اس کو بلکہ اس کے ذریعہ سے ایک جہان کے جہان کو فائدہ پہنچاتا ہے۔

(۳) اب دنیوی زندگی اور صاحب دنیا کی مثال بیان کی جاتی ہے:-

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ حَتّٰىٓ اِذَآ اَخَذَتْ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ اَتٰهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (یونس - ۳)

دنیوی زندگی کی مثال ایسی ہے جیسے مثلاً ہم نے آسمان سے پانی برسایا اور اس سے زمین کی نباتات جس کو آدمی اور چوپائے کھاتے ہیں سیراب ہوئی، یہاں تک کہ جب زمین نے اپنا سنگھار کر لیا اور خوشنما ہو چکی اور اہل زمین نے سمجھ لیا کہ اب وہ ان کی ہے تو (ناگاہ) ہمارا حکم اس پر رات یا دن کے وقت نازل ہو گیا اور ہم نے اس کا ایسا ستھراؤ کیا کہ گویا کل اس کا نام و نشان ہی نہ تھا۔ جو لوگ سوچتے اور سمجھتے ہیں ان کے لئے ہم اپنی نشانیاں اسی طرح تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے دنیوی زندگی کی تشبیہ اس طرح دی ہے کہ دنیا جب زیب و زینت کے لباس میں بن سنور کر سامنے آتی ہے تو انسان اس پر مفتوں ہو جاتا ہے اور حصول دنیا ہی اپنا مطمح نظر قرار دے لیتا ہے حتیٰ کہ فریب نفس اُسے یہاں تک پہنچا دیتا ہے کہ وہ اس زینتِ حیات کو اپنی ملک اور اپنے قبضۂ قدرت میں سمجھنے لگتا ہے۔ اس وقت یکایک کرشمۂ الٰہی نمودار ہوتا ہے اور اس کے ہاتھوں سے یہ محبوب ترین متاع چھین کر اسے خسران و ناکامی کی ناگہانی مصیبتوں اور حیرتوں میں چھوڑ جاتا ہے۔ اس کیفیت زندگی کی تشبیہ اللہ تعالیٰ نے زمین سے دی ہے جس پر بارش کی کرشمہ سازی سے نباتات کی ہری ہری چادریں بچھ جاتی ہیں اور اس باصرہ نواز منظر کو

دیکھ کر کسان بےخود و بےاختیار ہو جاتا ہے۔ اس وقت خدا اسے یاد نہیں آتا۔ نفس کے فریب میں آکر وہ اسے اپنی تدبیر کا نتیجہ اور اپنی ملک سمجھنے لگتا ہے کہ اچانک حکم الٰہی جاری ہوتا ہے اور یہ سارا سامانِ غرور آفات و حوادث کی نذر ہو کر رہ جاتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے اس کا طلسم ظن و غرور ٹوٹ جاتا ہے اور اسے دکھائی دیتا ہے کہ جس جگہ اس کے خوش آئند تخیلات کی حسین عمارت قائم تھی وہاں شکستہ کھنڈروں کے نشان بھی اب موجود نہیں ہیں۔ یہی حال دنیا کی رعنائیوں اور اس کے پر امید اور خود فریب پرستاروں کا ہے اگر غور کرو گے تو معلوم ہوگا کہ دنیا اور دنیا پرست کی کتنی بلیغ تشبیہ ہے۔

ضمناً ایک اور نکتہ بھی سمجھ لو۔ چونکہ دنیا آفات و حوادث کا مرکز، اور اس کے بالمقابل جنت اطمینان و سکون اور عافیت و سلامتی کا گہوارہ ہے اس لئے قرآن اس تنبیہ اور تذکیر کے بعد وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ کہہ کر جنت کی زندگی کی طرف بلاتا ہے۔ جنت کو دار السلام (سکھ کا گھر) کہنے کی وجہ یہی ہے کہ یہ مقام اُن تمام آفتوں، پریشانیوں اور بے اطمینانیوں سے مامون ہے جن کی شکار دنیا بنی ہوئی ہے۔ قرآن بلا لحاظ خاص و عام سب کو اس آنند بھون کی طرف دعوت دیتا ہے کہ عدل الٰہی اسی کا مقتضی ہے، اگرچہ ہدایت و معرفت کی سعادت صرف انہیں کو حاصل ہوتی ہے جن کو پروردگار عالم اس عزت و شرف سے نوازتا ہے وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ الخ۔

(۴) قبول حق کی استعداد اور عدم استعداد کی تمثیل:۔

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝

دونوں فریقوں کی مثال اندھے، بہرے اور آنکھوں والے اور سننے والے کی سی ہے، کیا دونوں کی حالت یکساں ہو سکتی ہے، کیا تم لوگ غور نہیں کرتے؟

قرآن نے اس آیت میں کفار کا ذکر کرتے ہوئے ان کی صفت یہ بیان کی ہے کہ وہ سننے سے معذور اور بصارت سے محروم ہیں۔ اور پھر ان کے مقابل مومنین کے اوصاف مثلاً ایمان، عمل صالح، محبت الٰہی

اور انابت الی اللہ وغیرہ کو بینائی اور سماعت سے تشبیہ دی۔ پہلے گروہ کو اندھا بہرا اس لئے کہا کہ ان کی پیشانی کی آنکھیں تو دیکھتی ہیں لیکن دلوں کی آنکھیں بے نور ہیں۔ حق کا بے نقاب چہرہ دیکھنے سے قاصر ہیں۔ اسی طرح وہ اوپر کے کانوں سے تو سنتے ہیں مگر اندر کے کانوں تک آوازِ حق کا گذر نہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی تشبیہ ایسے شخص سے دی ہے جس کی دیکھنے اور سننے کی قوتیں سلب کر لی گئی ہوں کہ نہ وہ کسی چیز کو دیکھ سکتا ہے اور نہ کوئی بات سن سکتا ہے۔ دوسرا گروہ مومنین کا ہے جو بیدار مغز ہے، جس کے دل کی آنکھ بھی صحیح سلامت ہے اور کان بھی۔ اس کو ایسے شخص سے تشبیہ دی ہے جو دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والا کان رکھتا ہے۔ یہ تمثیلیں بیان کر کے اللہ تعالیٰ ان دونوں کے برابر ہونے کی خود نفی نہیں کرتا بلکہ مخاطبوں ہی کی عقل و فکر سے سوال کرتا ہے کہ کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔ اس استفہامِ انکاری میں جو زور ہے وہ خود انکار کرنے میں کہاں ہو سکتا ہے۔

(۵) اولیاء مشرکین کی بے بسی کی مثال:۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ٥

(عنکبوت - ۴)

جن لوگوں نے خدا کے سوا دوسروں کو اپنا کارساز بنا رکھا ہے ان کی مثال مکڑی کی سی ہے کہ اس نے ایک گھر بنایا اور کچھ شک نہیں کہ سب گھروں میں کمزور گھر مکڑی کا گھر ہے۔ کاش یہ لوگ جانتے۔

یہاں اس حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ مشرکین تو مکڑی کی طرح کمزور و ناتواں ہیں ہی لیکن ان کے اولیاء و شرکاء ان سے بھی زیادہ بے بس اور مجبور محض ہیں۔ سو ان مشرکین کی ذاتی کمزوری و بے چارگی اور پھر اپنے سے بھی بے بس تر اولیاء سے مدد و قوت حاصل کرنے کی مثال مکڑی اور اس کے گھر کی سی ہے۔ اس مثل کے تحت مشرکین کے انتہائی خسران کا ذکر ہے کہ اگرچہ وہ بے یار و مددگار ہیں لیکن وہ اپنی محرومی و

کمزوری کے نقطۂ کمال پر اس وقت پہنچے جب کہ انھوں نے اپنے سے بھی زیادہ مجبور مخلوق کو اپنا ولی و مددگار بنایا جن سے وہ سوائے ضعف و خسران کے کچھ نہیں پا سکتے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ مشرکین و کفار سبھی جانتے ہیں کہ تار عنکبوت کمزور ترین شے ہے پھر اس سے "لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ" کے ذریعہ ان کی واقفیت و علم کی نفی کیوں کی گئی ہے؟ اس کا جواب بالکل واضح ہے۔ آیت کا مقصد ان کے اس علم کی نفی کرنا نہیں ہے کہ مکڑی کا گھر سب سے زیادہ کمزور ہے بلکہ اس علم کی نفی کرنا ہے کہ خدائے واحد کے سوا جو معبود اور اولیا ٹھیرائے جاتے ہیں ان کی قوت اور قدرت تار عنکبوت سے زیادہ نہیں ہے۔ اگر وہ اس حقیقت کو جانتے ہوتے تو ایسا ہرگز نہ کرتے۔ وہ تو یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ یہی اولیار ان کو قوت و جبروت بخشیں گے لیکن اس کی حقیقت خواب سے زیادہ نہیں ہے (۱) نہ کبھی ثابت ہوئی۔

اس مضمون کی بکثرت آیتیں ملتی ہیں جن میں یہی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ مثلاً ایک جگہ قرآن کہتا ہے:۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً	انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر بہت سے خدا بنا رکھے ہیں کہ وہ ان کے مددگار
لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا كَلَّا سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ	ہوں گے۔ مگر وہ ہرگز مددگار نہ ہوں گے۔ قریب ہے کہ وہ خود ان کی
وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا (مریم۔ ۵)	بندگی کا انکار کریں گے اور الٹا ان کے دشمن ہو جائیں گے۔

دوسری جگہ ہے:۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً	ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر بہت سے خدا بنا لیے یہ سمجھ کر کہ وہ انکی
لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ	مدد کریں گے۔ مگر وہ ان کی مدد نہیں کر سکتے۔ بلکہ یہ بت پرستوں کے
وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ (یس۔ ۵)	لشکری بنے ہوئے قیامت میں خود جواب ہی کیلئے حاضر ہوں گے۔

ایک مقام پر مشرکین کی ہلاکت و تباہی بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:۔

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ	اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انھوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا۔ اور جب
فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ	تیرے پروردگار کا حکم (عذاب) آیا تو خدا کے سوا وہ جن معبودوں

دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ (ہود - ۹)

کو پکارا کرتے تھے وہ ان کے کچھ بھی کام نہ آئے (بلکہ) انہوں نے ان کی تباہی کچھ اور بڑھا دی۔

ان چاروں مقامات پر یہ حقیقت آشکارا کی گئی ہے کہ جس نے خدا کو چھوڑ کر شرکا اور اولیا کا دامن سربلندی وسرفرازی اور نصرت و امداد حاصل کرنے کے لئے پکڑا وہ ناکام رہا اور اس کی یہ عبادت مفید و منفعت بخش ہونے کے بجائے الٹی وبال جان بن گئی۔ یہ مثل جو اوپر بیان ہوئی شرک کے ابطال، مشرکین کے خسران اور ان کے انجام کی ہولناکی اور تباہ کاری کی سب سے زیادہ روشن اور بلیغ تمثیل ہے۔ (باقی)

ترجمان القرآن کے سابق پرچے

ترجمان القرآن کے مندرجۂ ذیل سابق پرچوں کی دفتر ہذا کو ضرورت ہے۔ جو حضرات ان پرچوں کو قیمتاً فروخت کرنا چاہتے ہوں۔ یا جنکے پاس یہ پرچے فالتو موجود ہوں۔ وہ براہ کرم ان پرچوں کو بذریعۂ ڈاک ہمارے پاس روانہ کردیں اور "لفافہ" پر اپنا مکمل پتہ تحریر فرماویں تاکہ ۸ر فی پرچہ کے حساب سے اُن کو قیمت روانہ کی جاسکے۔

رسائل و اخبارات کے ایڈیٹر صاحبان سے بھی گزارش ہے کہ اگر وہ مکمل فائل نہ رکھنا چاہتے ہوں۔ اور ان کے پاس یہ پرچے ہوں تو وہ بھی ان پرچوں کو بھجوا کر قیمت وصول کریں۔

سال	جلد	عدد	ماہ
سال ۵۲ھ	جلد ۲	عدد ۱	ماہ محرم
"	جلد ۳	عدد ۲	ماہ شعبان
"	جلد ۳	عدد ۳	ماہ رمضان
سال ۵۴ھ	جلد ۶	عدد ۱	ماہ محرم
"	"	" ۲	ماہ صفر
"	"	" ۳	ماہ ربیع الاول
"	"	" ۴	ماہ ربیع الثانی
سال ۵۶ھ	جلد ۱۰	عدد ۲	ماہ صفر
"	"	" ۳	ماہ ربیع الاول
"	"	" ۴	ماہ ربیع الثانی
"	جلد ۱۱	" ۲	ماہ شعبان
"	"	" ۳	ماہ رمضان
سال ۵۸ھ	جلد ۱۲	عدد ۵	ماہ جمادی الاولیٰ
"	"	" ۶	ماہ جمادی الاخریٰ
"	جلد ۱۳	" [illegible]	ماہ رجب

منیجر

سورۂ صافات کی قسمیں

از جناب مولوی داؤد اکبر صاحب

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۙ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۙ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ۙ اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ۭ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ۭ

قرآن مجید کے ایک طالب علم نے سورۂ صافات کی قسموں کی غرض اور مقسم بہ اور مقسم علیہ میں ربط دریافت کیا ہے۔ اس باب میں قبل اس کے کہ ہم اپنی کوئی تحقیق پیش کریں مناسب ہوگا کہ مفسرین کرام کی نگاہِ کشف وتحقیق نے ہماری رہنمائی کے لئے جو نقوش چھوڑے ہیں ان کی طرف مراجعت کرلی جائے تاکہ اصل مقصود تک پہنچنے میں آسانی ہو۔

پیش نظر سورہ کی قسموں کی بابت یوں تو تمام مفسرین نے کچھ نہ کچھ بحث کی ہے مگر اس بارے میں حضرت امام رازی علیہ الرحمۃ نے جس تمام وکمال سے تحقیق وتدقیق کی ہے یہ کچھ انہیں کا حق ہے۔ فرماتے ہیں اس میں دو احتمال ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ان صفات کا موصوف ایک ہی ہو۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ ان صفات کا موصوف مختلف ہو۔ پہلی صورت لینے میں اس کی مختلف توجیہیں ہوں گی:۔

۱۔ ان صفات کے موصوف ملائکہ قرار دیے جائیں۔ اس لحاظ سے تاویل یوں ہوگی۔

الف۔ وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا یعنی قسم ہے ان ملائکہ کی جو صف بستہ ہیں۔ ملائکہ یا تو عبادتِ الٰہی کے لئے صف بصف آسمانوں میں مستعد رہتے ہیں جیسا کہ انہیں کی زبانی ارشاد ہے "وَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ"۔ یا اس سے یہ مقصود ہے کہ وہ اپنے روحانی بازوؤں کو فضا میں پھیلائے ہوئے امر خداوندی کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ اور اس کا بھی احتمال ہے کہ فرشتوں کے صف بصف ہونے کا یہ مفہوم ہو کہ ملائکہ میں سے ہر ایک کے لئے الگ الگ درجہ متعین ہے۔

ب۔ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا۔ اس کی بھی مختلف توجیہیں ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس سے وہ ملائکہ مراد ہیں جو بادلوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لیے پھرتے ہیں۔ اس کا بھی احتمال ہے کہ اس سے وہ ملائکہ مراد ہوں جو الہام کی صورت سے قلوب انسانی میں تاثیر پیدا کرتے ہیں۔ یا یہ کہ اس سے وہ ملائکہ مراد ہوں جو انسانوں سے ارواح خبیثہ کو دور کیا کرتے ہیں۔ ان اقوال کو بیان کرنے کے بعد حضرت امام رازی علیہ الرحمۃ اس دوسری صفت کے متعلق اپنے مخصوص انداز میں فرماتے ہیں:۔

"فلاسفہ کے نزدیک طے شدہ ہے کہ موجودات کی تین قسمیں ہیں ایک سراپا تاثیر ہے اور وہ خداوند تعالیٰ کی ذات بابرکت ہے۔ دوسرا عالم اجسام ہے اور یہ سراپا تاثر وانفعال ہے۔ تیسرا عالم ارواح (ملائکہ) ہے اور یہ وہ جماعت قدسی ہے جس میں کارساز فطرت کی طرف سے تاثر و تاثیر دونوں طرح کی قوتیں ودیعت کی گئی ہیں۔ یہ ایک طرف تو انوار الٰہی سے فیضیاب ہوتی ہے اور دوسری طرف قلوب انسانی پر بھی اثر ڈالتی ہے۔"

ج۔ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا۔ اس میں اشارہ ہے کہ یہی وہ صفت ہے جس سے ملائکہ اپنی روحانیت میں ترقی دیکر عالم اجسام پر اثر ڈالتے ہیں۔

اس کے بعد امام صاحب فرماتے ہیں:۔

مقدمہ بالا کی روشنی میں غور کرو تو تم پر یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ پہلی صفت (وَالصّٰٓفّٰتِ) میں اشارہ ہے کہ ملائکہ صف بصف خداوند تعالیٰ کی بارگاہ عالی میں سرنیاز خم کئے رہتے ہیں۔ اور یہی وہ طریقہ ہے جس سے ملائکہ انوار الٰہی اور تجلیات ربانی کے مہبط ہوتے ہیں۔ دوسری صفت (فَالزّٰجِرٰتِ) میں اشارہ ہے کہ جواہر ملکیہ (ملائکہ) قلوب انسانی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور انسانی قویٰ ادراکیہ کے حرکت میں لانے کے ایسے اسباب فراہم کرتے ہیں جو ان کی روحانی زندگی کے لئے ضروری ہیں۔ یہ نظام قدرت کی جانب سے اس لئے ہے کہ ارواح بشری اپنی تکمیل میں ارواح ملکیہ کی محتاج ہے اور یہ تو مسلمات میں سے ہے کہ ارواح بشری کی باتقویٰ

طاقتوں کے بالفعل ہونے میں ملائکہ کا بہت زبردست ہاتھ ہے۔ یہ محض دعویٰ ہی نہیں بلکہ اس کی سند میں بے شمار دلیلیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں چند ملاحظہ ہوں۔

(۱) يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ — وہ نازل فرماتا ہے ملائکہ کو روح کے ساتھ اپنے حکم سے اپنے
عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ .... — بندوں میں سے جس پر بھی وہ مناسب سمجھتا ہے۔

ایک دوسری جگہ ہے:۔

(۲) نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ — روح امین (جبرئیل) نے تمھارے دل پر اسے نازل کیا ہے۔

اس کے بعد امام صاحبؒ نے اس آیت سے متعلق ایک اور نہایت لطیف نکتہ بیان فرمایا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

حقیقی کمال کسی چیز کو اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب وہ چیز خود مکمل و اکمل ہو۔ مکمل ہونے کا یہ منشا ہے کہ وہ ان تمام خوبیوں سے آراستہ ہو جو اس کے شایان شان ہوں۔ اور اکمل ہونے کا یہ منشا ہے کہ اس کا فیض دوسروں تک پہنچے۔ اور یہ مسلّم ہے کہ دوسرے کی تکمیل سے مقدم خود باکمال ہونا ہے۔ اس کے بغیر اصلاح وارشاد بے معنی ہے۔ لہٰذا پہلی صفت میں اشارہ ہے کہ ملائکہ اپنی تکمیل کے لئے ہمہ تن طاعتِ الٰہی میں چست رہتے ہیں اور دوسری صفت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ انسانی قلوب سے وہ تمام کی تمام خرابیاں دور کرنے میں کوشاں رہتے ہیں جو فطرتِ انسانی کے سر اسر منافی ہیں اور تیسری صفت میں اشارہ ہے کہ وہ ارواحِ بشری کے انوارِ الٰہی سے مستنیر ہونے میں شریک ہیں۔

۲۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ یہ اوصاف گروہِ انسانی پر محمول کی جائیں اور اس کی دو شکلیں ہیں:۔

(۱) وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا سے انسانوں کی وہ صفیں مراد لی جائیں جو نماز کی ادائیگی کے وقت صف بصف قائم کی جاتی ہیں، اور فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا سے نمازیوں کا اعوذ باللہ پڑھنا مراد لیا جائے گویا اس کلمہ سے نمازی اپنے پاس سے شیاطین کو دور بھگاتے ہیں۔ اور فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا سے ان کا نماز میں قرآن پڑھنا مراد لیا جائے دوسری صفت کی ایک اور توجیہ بھی بہت مشہور ہے وہ یہ کہ اس کا مقصود یہ ہے کہ نمازی نہایت بلند آہنگی کے ساتھ قرآن پڑھتے ہیں جس کی مصلحت شیاطین کو بھگانا ہے چنانچہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی قرأت والی روایت

میں یہی مصلحت مذکور ہے۔

(۲) دوسری شکل یہ ہے کہ اس سے علماء محققین کی وہ صف بصف جماعت مراد لی جائے جو دین الٰہی کی تبلیغ میں منہمک رہتی ہے اور دوسری صفت سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اوامر و نواہی میں غایت درجہ دلچسپی رکھتے ہیں اور تیسری صفت میں اشارہ ہے کہ وہ دین الٰہی کی تبلیغ بھی کرتے ہیں اور اتباع شرائع پر بھی لوگوں کو ابھارتے ہیں۔

۳۔ تیسری توجیہ یہ ہے کہ ان صفات کو مجاہدین (فی سبیل اللہ) پر منطبق کیا جائے یعنی پہلی صفت سے جنگ کی صفیں مراد لی جائیں اور قرآن پاک میں مذکور بھی ہے کہ "اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا" دوسری صفت سے یہ مقصود ہے کہ وہ اثنائے جنگ میں گھوڑوں کو ڈانٹ بتاتے ہیں۔ اور تیسری صفت سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ میدانِ جنگ کی گرماگرمی کے وقت بھی انکی زبانیں یادِ الٰہی سے غافل نہیں ہوتیں۔

۴۔ چوتھی توجیہ یہ ہے کہ یہ صفات آیاتِ قرآنی کی ہیں اور اس کی توجیہ یوں ہوگی کہ قرآن پاک کی آیات متعدد مباحث سے متعلق ہیں۔ کچھ تو وحدانیت اور علم الٰہی پر مشتمل ہیں اور کچھ قدرت خداوندی اور حکمت ربانی کے بارے میں واقع ہیں اور کچھ اخلاقیات و شرائع سے متعلق ہیں۔ خلاصہ یہ کہ پہلی صفت میں آیاتِ قرآنی کو صف بصف اشخاص کے مشابہ قرار دیا گیا ہے اور دوسری صفت سے ان آیات کی جانب اشارہ ہے جو نواہی پر مشتمل ہیں اور تیسری صفت ان آیات سے متعلق ہے جو اعمالِ خیر کے وجوب پر محرک ہیں۔

اب دوسری صورت لو یعنی یہ کہ ان صفات کا موصوف ایک نہیں بلکہ الگ الگ قرار دیا جائے۔ مثلاً پہلی صفت کے موصوف پرندے ہوں جیسا کہ قرآن پاک میں بھی ہے "وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ"۔ اور دوسری صفت سے وہ تمام کی تمام چیزیں مراد لی جائیں جو معاصی سے روکنے کا ذریعہ ہوں۔ اور تیسری صفت سے (بلا تخصیص) وہ تمام کی تمام باتیں مراد لی جائیں جو کلام الٰہی میں سے پڑھی جاتی ہیں۔

اس دوسری صورت کے متعلق امام صاحب فرماتے ہیں :-

" خداوند تعالیٰ کی مخلوقات یا تو جسمانی ہیں - یا روحانی - مخلوقات جسمانیہ کے مختلف مدارج وطبقات ہیں جن میں سرمو تغیر نہیں ہوتا مثلاً زمین وسط عالم ہے اور کرہ مائی سے محیط ہے - پانی ہوا سے محیط اور ہوا آگ سے محیط ہے - مزید براں یہ کہ عناصر اربعہ طبقات فلکی سے عالم اجسام کے آخری حصہ تک محیط ہیں - پس عالم اجسام گویا جلال الٰہی کے سامنے صف بصف کھڑا ہے - رہے جواہر روحانیہ ملکیہ (ملائکہ) تو وہ باوجود اختلاف مدارج وصفات دو صفتوں میں مشترک ہیں - ایک تو عالم اجسام میں تاثیر وتصریف ہے جس پر یہ آیت (فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا) صریحاً دلالت کر رہی ہے - اور دوسری صفت خداوند تعالیٰ کی معرفت میں استغراق ہے ، چنانچہ فَالتّٰلِیٰتِ ذِکْرًا میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے - چونکہ عالم اجسام درجہ میں عالم ارواح سے ادنیٰ ہے اور جسمانیات میں تصرف بمقابلہ عالم ارواح کے آسان ہے اس لئے پہلے درجہ میں عالم اجسام کو رکھا گیا اور دوسرے درجہ میں ان ارواح طیبہ کو رکھا جو عالم اجسام پر تصرف کرتے ہیں اور تیسرے درجہ میں ان ارواح مقدسہ کو رکھا ہے جو ہمہ تن خدا کی تسبیح وتہلیل میں لگی رہتی ہیں "

اس کے بعد امام موصوف نے دو ایسے گروہوں کے اقوال نقل کیے ہیں جن میں سے ایک کا خیال ہے کہ نفس اشیاء مذکورہ مقسم بہ نہیں ہیں بلکہ ان اشیاء کا خالق مقسم بہ ہے - اور دوسرے فریق کے نزدیک نفس اشیاء مذکورہ ہی مقسم بہ ہیں - چونکہ امام موصوف نے ہر دو فریق کے اقوال کے نقل کر دینے ہی پر اکتفا کیا ہے اور اپنی کوئی رائے نہیں لکھی ہے اس لئے ہم اس بحث کی تفصیل پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتے -

حضرت امام رازیؒ نے اس سلسلہ میں ایک اور نہایت اہم بحث کی ہے جس کا ایک طالب قرآن کے سامنے ہونا نہایت ضروری ہے اور وہ اس موقع پر قسم کھانے کی ضرورت یا عدم ضرورت کا مسئلہ ہے - اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ یہاں دو طرح کے شبہات پیدا ہوتے ہیں :-

(۱) ایک یہ کہ قسم کا مقصود یا تو مومن سے کوئی بات منوانا ہو سکتا ہے یا کافر سے۔ پہلی صورت تو باطل ہے اس لئے کہ مومن تو بغیر قسم ہی کے تسلیم کئے ہوئے ہے۔ اور دوسری صورت بھی باطل ہے اس لئے کہ منکر آپ کی بات قسم کھانے سے نہ تسلیم کرے گا بلکہ اسے دلیل ہی سے قائل کیا جا سکتا ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ خداوند تعالیٰ نے اس سورہ کے شروع میں وحدانیت پر قسم کھائی ہے اور سورۂ ذاریات کے اوائل میں وقوع قیامت کے ثبوت میں قسم کھائی ہے۔ ان مطالب عالیہ کو (ملاحدہ و دہریہ کے اوہام باطلہ کی تردید کے ساتھ) قسم کے ذریعہ سے ثابت کرنا عقلاء کے طریقے کے منافی ہے۔

ان شبہات کے تین جواب ہو سکتے ہیں:-

(۱) خداوند تعالیٰ نے وحدانیت اور بعث و قیامت کو زیادہ تر ابتدائی سورتوں میں یقینی دلائل کے ساتھ ثابت کر دیا ہے۔ پھر جب دلائل قطعیہ پوری طرح بیان کر دئے گئے تو دلائل ماسبق کی تاکید کیلئے قسم کھائی گئی۔ خصوصاً قرآن تو عربوں کی زبان میں نازل ہوا ہے اور قسم کے ذریعہ سے کلام میں زور پیدا کرنا ان کے ہاں کا عام طریقہ تھا۔

(۲) دوسرے یہ کہ جب خداوند تعالیٰ نے ان چیزوں سے وحدانیت کے ثبوت پر قسم کھائی تو اس سے متصل ہی ان براہین قاطعہ کا بھی ذکر کیا جو وحدانیت کے باب میں نہایت روشن دلائل ہیں۔ یعنی فرمایا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ۔ یہ قول اس بنا پر دلیل ہے کہ خداوند تعالیٰ نے اپنے اس قول میں (لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا) بیان فرمایا ہے کہ آسمان و زمین کا نظام وحدانیت پر شاہد ہے۔ بعینہٖ یہاں بھی جب یہ کہا گیا کہ (اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ) تو اس سے متصل ہی بطور دلیل کے یہ بیان کیا گیا (رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ) گویا یوں کہا گیا کہ آسمان و زمین کے نظام میں تفکر توحید باری پر شاہد ہے۔ پس اے لوگو! اس دلیل میں غور کرو تاکہ تمھیں توحید کا اذعان حاصل ہو۔

(۳) یہ کلام بت پرستوں کے اعتقاد کثرت آلہہ کے ابطال میں واقع ہے۔ گویا یوں کہا گیا کہ بت پرستوں کا مسلک اتنا بودا ہے کہ اس کے ابطال کے لئے تاکید کے ساتھ بس اتنا ہی کہدینا کافی ہے کہ تمہارا خدا ایک ہے۔

حضرت امام رازی علیہ الرحمۃ نے ان آیات سے متعلق جو کچھ فرمایا ہے اسے اجمالاً تین سرخیوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:-

(۱) مقسم بہ کی تعیین

(۲) مقسم بہ اشیاء مذکورہ ہی ہیں یا اس کے علاوہ کوئی دیگر شے ہے؟

(۳) مقسم بہ کا مقصود اس موقع پر کیا ہے؟

امام موصوف نے مقسم بہ کے بارے میں بہت سی صورتیں بیان فرما دی ہیں، مگر مقسم بہ اور مقسم علیہ میں مناسبت ڈھونڈھنے کی کوشش نہیں فرمائی، اس لیے بجز احتمالات کے نقل کرنے کے کوئی قطعی اور محکم رائے بھی ظاہر نہ کی۔ ممکن ہے ایسا اس لئے کیا ہو کہ اس سے طلبہ قرآن میں محنت و جانفشانی سے صحیح راہ تلاش کرنے کی قوت پیدا ہو۔ رہی یہ بحث کہ مقسم بہ نفس اشیاء مذکورہ ہیں یا ان کے علاوہ کوئی دیگر چیز ہے تو ہم نے جہاں تک غور کیا ہے اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ قرآن مجید میں قسم کھانے کی غایت و غرض پوری طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ بحث پیدا ہو گئی ورنہ یہ منصۂ شہود پر نہ آتی۔ اسی وجہ سے یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ اس موقع پر قسم کھانا مناسب تھا یا نہیں یا یہ کہ یہاں پر قسم کھانے میں کیا مصالح ہیں؟ امام موصوف نے پہلے تو اس موقع پر قسم کھانے میں چند در چند زحمتیں بیان فرمائی ہیں۔ اس کے بعد ان زحمتوں کے مختلف حل بتائے ہیں لیکن ایک صاحب بصیرت سے پوشیدہ نہیں کہ امام موصوف کے ان جوابات میں بہت ہی تضاد ہے۔ مثلاً پہلے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ قسم دلائل سے مسبوق ہوا کرتی ہے، اور اصل اعتبار دلائل کا ہے، اور قسم تو محض عربوں کے عام طریقہ کے مطابق محض تاکید کے لئے لائی جاتی ہے۔ غور کیجئے ترتیب قرآن سے یہ جواب کتنا البعد ہے اس لئے کہ قسمیں تو زیادہ تر ان سورتوں میں آئی ہیں جو پہلے نازل ہوئیں۔ اور دلائل بعد کی سورتوں

میں بیان ہوئے ہیں۔ امام موصوف کے دوسرے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ قسم کے بعد اس موقع پر ایک ایسا قول مذکور ہے جس میں حجت و برہان کا بہت ہی زبردست پہلو ہے، اور قسم محض تنبیہ کے لئے ہے۔ دیکھئے! اس جواب میں اور ماقبل والے میں کیا سرمو بھی فرق ہے؟ اور دونوں میں سے کیا ایک میں بھی اصل مسئلہ سے متعلق کچھ کہا گیا ہے؟ تیسرا جواب تو بہت ہی گرا ہوا ہے وہ اس لئے کہ پہلے دونوں جوابوں میں تو امام موصوف نے یہ دعویٰ کیا کہ قسم میں شہادت کا کوئی پہلو نہیں اور تیسرے جواب میں اس کا حجت ہونا خود ہی تسلیم کر لیا ہے گو کہ ہلکے درجہ کی حجت[۱] و دلیل۔

ذیل کی سطروں میں اب ہم مقسم بہ کی تعیین قسم کی اس موقع پر ضرورت، اور مقسم بہ اور مقسم علیہ میں مناسبت کی بابت اپنی رائے پیش کریں گے لیکن مناسب ہوگا کہ قبل اس کے کہ ان مباحث کی تحقیق میں پڑیں ایک نہایت ضروری مرحلہ سے گذر لیا جائے اور وہ پیش نظر سورہ کی قسموں کے عمود کی تعیین ہے۔

سورہ کا مرکز | پیش نظر سورہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ توحید اور قیامت کے ثبوت میں وارد ہے یعنی ایک طرف تو اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا میں جتنی بھی مخلوقات ہیں ان میں سے ہر ایک خدا کی بے پایاں قدرت کا مظہر ہے۔ کوئی چیز اس سے بے نیاز ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ہر ایک کی ضروریات کا مرکز وہی ہے۔ اس کے علاوہ تمام کے تمام رشتے بے معنی ہیں۔ مخلوقات کی احتیاج بالخصوص حضرت انسان کی ضروریات یہیں پر ختم نہیں ہوتیں بلکہ کل کی زندگی میں جب خدا کی عدالت عالیہ قائم ہوگی تو وہ رحمت خداوندی کا اور زیادہ محتاج ہوگا۔ الغرض اگر یہ سورہ غور سے پڑھی جائے تو ہر شخص کو بادنیٰ تامل نظر آ سکتا ہے کہ پوری سورہ میں یہی دونوں حقیقتیں پھیلی ہوئی ہیں۔

مقسم علیہ کی تعیین کے بعد اب ہم مقسم بہ کی شرح و تعیین کریں گے۔

مقسم بہ کی شرح و تعیین | وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا

[۱] ماخوذ از امعان فی اقسام القرآن مصنفہ صاحب نظام القرآن صفحہ ۵ - ۶

فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا۔ تفسیروں کے استقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ مفسرین میں سے بیشتر لوگوں کا ان اوصاف کے بارے میں یہی خیال ہے کہ ان کا موصوف گروہ ملائکہ ہے۔ ہمارے نزدیک بھی یہی صورت انسب ہے اس کے علاوہ جتنی صورتیں مذکور ہیں ان میں سے کوئی بھی چسپاں نہیں ہوتی۔ وجوہ ترجیح مناسبت کی بحث سے سمجھ میں آجائیں گے۔

قسم کی غرض اوپر کی سطروں سے مقسم بہ کی تعیین ہوگئی۔ رہا یہ سوال کہ اس موقع پر قسم کیوں لائی گئی؟ اس کا وہ جواب انسب نہیں جو حضرت امام رازی علیہ الرحمۃ نے اختیار کیا ہے بلکہ اس باب میں صاحب نظام القرآن نے قسم کا جو مفہوم بیان کیا ہے اگر اسے سامنے رکھا جائے تو وہ تمام کی تمام دقتیں جو امام موصوف کے جواب سے پیدا ہوجاتی ہیں یکقلم دور ہوجائیں گی یعنی یہ کہ قسم کا اصل مقصود استشہاد ہے۔ تعظیم و احترام کا پہلو انہیں مواقع پر ہوگا جہاں خداوند تعالیٰ کی ذات بابرکت یا اس کے شعائر کی قسم کھائی گئی ہو۔ اور اس صورت میں بھی یہ تعظیمی پہلو ضمنی ہوگا۔ اصل مقصد استشہاد و استدلال ہی ہوگا۔ کلام عرب سے بھی اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ تفصیل کے لئے امعان فی اقسام القرآن کا مطالعہ کرنا چاہئیے۔

سطور بالا سے مقسم بہ کی تعیین اور قسم کی حقیقت اجمالاً سمجھ میں آگئی ہوگی۔ اب ہم مقسم بہ اور مقسم علیہ میں مناسبت دریافت کریں گے۔

مقسم بہ اور مقسم علیہ میں مناسبت یہ بیان ہوچکا ہے کہ پیش نظر سورہ توحید و قیامت کے ثبوت میں وارد ہے یعنی یہ کہ اس عالم میں جتنے بھی انقلابات و تغیرات ہوتے ہیں سب کا مرکز محض ایک ذات ہے۔ وہی سب کچھ کرتی ہے۔ اس کے ایما کے بغیر کوئی تبدیلی بھی ظہور میں نہیں آسکتی۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکت ہے۔ ایسی ذات جس کی قدرت و تصرف کے بے شمار مظاہر ہیں، ضرور بالضرور اس نے اس عالم کی پیدائش کی کوئی اہم غایت رکھی ہوگی۔ اسی کو قرآن قیامت سے تعبیر کرتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ پیش نظر سورہ کے دعویٰ اور دلیل میں کوئی مناسبت ہے یا نہیں؟۔

قرآن مجید کے طالب علم سے یہ مخفی نہیں کہ قرآن پاک میں بے شمار ایسی آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ منجملہ جنود الٰہی ہیں۔ ذیل کی آیتوں پر غور کیجئے:-

سورہ انفال میں ہے:-

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ وَلِتَطْمَئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا ۚ سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ (رکوع اول)

یاد کرو اس وقت کو جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کرتے تھے پس اس نے تمہاری فریاد سن لی کہ میں لگاتار ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کروں گا اور خدا نے فرشتوں کی مدد تمہیں خوش کرنے کیلئے کی ورنہ فتح تو خدا ہی کے ہاتھ میں ہے بیشک خدا غالب اور حکمت والا ہے۔ یاد کرو اس وقت کو جب کہ خدا تمہاری تسکین کے لئے نیند تم پر طاری کر رہا تھا اور آسمان سے تم پر پانی برسا رہا تھا کہ اس سے تم کو پاک کرے اور شیطانی گندگی تم سے دور کرے اور تاکہ تمہارے دلوں کی ڈھارس بندھائے اور اس کے ذریعہ سے تمہارے قدم جمائے رکھے، یاد کرو اس وقت کو جب کہ تمہارا پروردگار فرشتوں کو حکم دے رہا تھا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں پس تم مسلمانوں کے قدم جمائے رکھو عنقریب کافروں کے دل میں رعب ڈالیں گے پس مارو گردنوں پر اور مارو ان کے پور پور پر۔

ایک دوسری جگہ ہے:-

ثُمَّ أَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنزَلَ جُنُودًا لَّمْ

پھر خدا نے اپنے رسول پر اور مسلمانوں پر تسلی نازل فرمائی اور غیر مرئی فوجیں بھیجیں اور کافروں کو سخت مار ماری

تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَذٰلِكَ
جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ٥ (توبہ-۴)

اور کافروں کی یہی جزا ہے۔

ایک دوسرے موقع پر ہے:-

إِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ
إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ
إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ
إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَأَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهُ عَلَيْهِ
وَأَيَّدَهُ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا
وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ٥ (توبہ-۶)

اگر تم اس کی مدد نہ کرو (تو کچھ پروا نہیں) اس لئے کہ اس نے اس وقت اپنے رسول کی مدد کی تھی جب کافروں نے گھر سے باہر نکال دیا دو میں دوسرے اس وقت یہ دونوں غار میں تھے، یاد کرو اس وقت کو جبکہ وہ اپنے رفیق سے کہہ رہا تھا غم نہ کرو بیشک خدا ہمارے ساتھ ہے پس خدا نے اپنی تسلی اس پر نازل فرمائی اور غیر مرئی افواج سے اس کی مدد کی اور کافروں کی بات کو نیچی کر دیا اور خدا ہی کا بول بالا ہے اور خدا غالب حکمت والا ہے۔

ایک اور مقام پر ہے:-

إِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ أَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ
أَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ
مُنْزَلِيْنَ ٥ بَلٰٓى إِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَ
يَأْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ
بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ

(آل عمران-۱۳)

یاد کرو جبکہ تم مسلمانوں سے کہہ رہے تھے کہ کیا تمہارے لئے یہ بس نہیں ہے کہ تمہارا پروردگار تین ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے ضرور، بلکہ اگر تم ثابت قدم رہو اور تقویٰ اختیار کرو اور دشمن اسی دم تم پر چڑھ دوڑیں تو تمہارا پروردگار پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔

سورۂ ذاریات میں ہے:-

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ○ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ○ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ○ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ○ (رکوع ۲)

کہا تمھاری کیا مہم ہے اے فرستادگان.. وہ بولے ہم ایک گنہگار قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں تاکہ ان پر پتھراؤ کریں جو مسرفین کے لئے خدا کے یہاں نامزد ہے . . . .

مذکورہ بالا آیات میں تصریح ہے کہ خدا کی غیر مرئی فوجوں میں سے ملائکہ بھی ہیں اور اس غیر مرئی فوج سے بارہا اس نے حق پرستوں کی تائید کی ہے، اور پرستاران باطل کو پسپا کیا ہے۔ ایسا تقریباً ہر پیغمبر کے عہد میں ہوا ہے۔ قرآنی تصریح کے بعد مزید دلائل کی ضرورت نہیں۔

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ مناسبت کے سلسلہ میں جو کچھ تم نے کہا ہے اس سے اصل سوال تو حل نہ ہوا؟ واقعتاً ایسا ہی ہے لیکن جب مذکورہ بالا تصریحات کی روشنی میں غور کیا جائے گا تو ہر شخص یہ تسلیم کرے گا کہ دنیا میں رحمت اور نقمت کے بے شمار مظاہر فرشتوں کے ہاتھوں ظہور میں آتے ہیں۔ فرشتے ہی تھے جو حضرت ابراہیم کے پاس پیامِ بشارت لائے تھے۔ اور یہی فرشتے قوم لوط کے لئے صاعقۂ ہلاکت ثابت ہوئے۔ اور یہی فرشتے تھے جو قرن اول میں حزب اللہ کے پہلو بہ پہلو حزب الشیطان سے برسرپیکار نظر آتے تھے۔ الغرض ملائکہ کے ہاتھوں دنیا میں جو رحمت و نقمت ظہور میں آتی ہے اس میں وحدانیت اور عدالت کبریٰ کے ثبوت پر کافی شہادت ہے۔ وہ اس طرح کہ ملائکہ کا پرستاران حق کے پہلو بہ پہلو احقاق حق اور استیصال باطل میں جد و جہد کرنا دلیل ہے اس امر کی کہ یہ کسی کے ماتحت ہیں اور یہ ان تمام لوگوں کے دشمن ہیں جو حدود اللہ سے سرکشی کرتے ہیں، اور ان لوگوں کے دوست ہیں جو خدا کی سرزمین پر رشد و ہدایت کی تبلیغ کرتے ہیں نیز یہ کہ فرشتوں کے کارنامں میں جو تضاد پایا جاتا ہے یعنی مومنین کے ساتھ ان کی شفقت و ہمدردی خواہ ہاتھ سے ہو یا زبان سے اور کفار کے ساتھ ان کی تندی و سختی[ل] یہ شاہد ہے اس امر پر کہ ہو بہو یہی نقشہ (تفریق بین الصالح والمفسد) قیامت کے دن بھی پیش آئے گا۔

ل قرآن مجید میں بے شمار ایسی آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ منکرین دین کے حق میں بد دعا اور اظہار لعنت کرتے ہیں اور مومنین کے لئے بارگاہِ الٰہی میں رحمت کی دعا کرتے ہیں اور ظن غالب یہ ہے کہ پیش نظر سورہ میں فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب — داؤد اکبر اصلاحی

رسائل و مسائل

صفاتِ باری تعالیٰ

لکھنؤ سے ایک صاحب لکھتے ہیں:-

"میں ان لوگوں میں زندگی کے بہترین اوقات صرف کر رہا ہوں جو منکر مذہب ہیں اور تنہا وہی گمراہ نہیں ہیں بلکہ ہزاروں کو وہ گمراہ کرتے رہتے ہیں۔ میں ان میں رہتا ہوں اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان تمام تر گمراہیوں کا منشا صرف دین سے ناواقفیت ہے اور بس۔

فضا اور ماحول کو دیکھتے ہوئے میرا دل بہترین توقعات سے لبریز ہے۔ میں کچھ کام کر چکا ہوں، کچھ کر رہا ہوں اور آئندہ بھی مجھے کچھ کرنا ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ میں آپ کو اپنی امداد کے لئے تکلیف دینی چاہتا ہوں، اس لئے کہ مجھے جو کام لینا ہے آپ کے سوا اس کا کوئی دوسرا اہل نظر نہیں آتا۔

خدا کے وجود کا ہر شخص کو اعتراف ہے خواہ وہ کوئی مذہبی انسان ہو یا دہریہ، کوئی فاطر کہتا ہے اور کوئی فطرت۔ صرف الفاظ کے گورکھ دھندے ہیں، مفہوم سب کا واحد ہے لیکن مسلمان خدا کو "با نہ و نوزدہ" صفات کے تسلیم کرتے ہیں۔

مجھے "وجود خدا با ایں ہمہ صفات" کے دلائل درکار ہیں۔ ایک دلیل ہو یا چند، دلائل ایسے ٹھوس اور مضبوط ہوں کہ "جدید روشنی" خیرہ نہ کر سکے، مختصر ہوں اور جامع ——— بس۔"

ترجمان القرآن۔ باری تعالیٰ کے ۹۹ اسماء تو وہ ہیں جو ہمیں بتائے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ

بے حد وحساب اسمارِ حسنیٰ اور بھی ہیں جن کا ہمیں علم نہیں۔ حدیث میں آیا ہے اسئلك بكل اسم ھولك وسمیت به نفسك او انزلته فی کتابك او استأثرت به فی علم الغیب عندك[1] پس ۹۹ کی تخصیص درست نہیں۔

محض وجود باری کا اقرار صحت ایمان کے لئے کافی نہیں ہے۔ کم از کم ان صفات کا علم و ادراک ضروری ہے جن کی تصریح قرآن میں ہے۔ مثلاً ربّ العلمین، رحمٰن، رحیم، سمیع، بصیر، خبیر، فعال لما یرید، دیان، منتقم وغیرہ۔ اس لئے کہ صحتِ ایمان اور صحت عمل کا تمام تر انحصار اس امر پر ہے کہ خدا اور کائنات، اور خدا اور انسان کے تعلق کی حقیقی نوعیت ہمیں معلوم ہو، اور یہ اسمار صفات اسی نوعیت کو واضح کرتے ہیں۔ جو شخص مثلاً وجود باری کا مقر ہے مگر یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کائنات کو پیدا کر کے فارغ ہو بیٹھا ہے (نعوذ باللہ) اور اب اس کائنات کا نظم و نسق خود بخود بالاستقلال (INDEPENDENTLY) چل رہا ہے، اور اس کے انتظام سے بالفعل خدا کا فرمانروایانہ تعلق نہیں ہے، اس کا خدا کو ماننا بے معنی ہے۔ وہ گویا خدا کو اس طرح مانتا ہے جس طرح ایک موٹر خریدنے والا اس بات کو مانتا ہے کہ اس کا میکر فورڈ یا آسٹن ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ماننے سے موٹر کے ساتھ اس کا معاملہ اور برتاؤ متعین یا کسی طور پر بھی متاثر نہیں ہوتا۔ اسی طرح محض یہ ماننے سے کہ کائنات کا اور خود انسان کا میکر خدا ہے، کائنات کے ساتھ اور خود اپنے وجود کے ساتھ انسان کے معاملہ کی نوعیت بھی معین نہیں ہوتی۔ نہ کسی طور پر متاثر ہوتی ہے۔ اسلام کا مقصود تو صرف اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب انسان اپنے ساتھ اور سارے عالم کے ساتھ باری تعالیٰ کے تعلق کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ لے۔ اسے معلوم ہونا چاہئے کہ باری تعالیٰ قیوم ہے، فعال لما یرید ہے، ربّ ہے، علیم و خبیر ہے، قاہر فوق عبادہ ہے، ظالم نہیں ہے بلکہ رحمٰن و رحیم ہے، حکیم ہے (یعنی اس کا

---

[1] خدایا میں تجھ سے دعا کرتا ہوں ہر اس نام کے ساتھ جو تیرا ہے جس سے تونے اپنے آپ کو موسوم کیا ہے۔ یا جسے اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے، یا جو تیرے علم غیب میں ہے اور بندوں کو تو نے اس کی خبر نہیں دی ہے۔

کوئی فعل عبث نہیں ہو سکتا) یوم الدین کا مالک ہے (یعنی اس کی عدالت میں ہم سب کو ایک روز حاضر ہونا اور اپنی دنیوی زندگی کا پورا حساب پیش کرنا ہے)، وغیر ذالک۔ یہ علم دنیا کی زندگی میں ہمارے طرز عمل کو کسی اور صورت سے معین کرے گا، اور اگر ہم اس علم سے خالی ہوں، یا اس علم میں نقص ہو تو ہمارا طرز عمل لازمی طور پر کوئی دوسری ہی صورت اختیار کرلے گا۔ مثلاً جو شخص نہیں جانتا کہ اس ملک کا کوئی بادشاہ ہے اس کا طرزِ عمل اس شخص سے مختلف ہو گا جو جانتا ہے کہ یہ ملک کسی بادشاہ کا ہے۔ اور جو شخص جانتا ہے کہ بادشاہ ہے مگر یہ سمجھتا ہے کہ وہ بے اختیار ہے، بالفعل حکمراں نہیں ہے، اپنے محل میں پڑا سوتا رہتا ہے، اور حقیقی حکمرانی کے اختیارات کچھ دوسرے لوگوں کو حاصل ہیں یا رعایا فرداً فرداً مختار ہے، اس کا طرز عمل اس شخص سے مختلف ہو گا جسے معلوم ہے کہ بادشاہ بالفعل حاکم ہے اور قادر مطلق ہے اور کوئی اس کی حکومت میں دخیل نہیں۔ اسی طرح جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ بادشاہ کے ہاں جانب داری (FAVOURITISIM) کا دور دورہ ہے اس کا طرز عمل کچھ اور ہو گا، اور جو یہ سمجھتا ہے کہ بادشاہ بے لاگ حکومت کرنے والا ہے، اور کسی کے ساتھ اس کا خصوصی تعلق نہیں ہے اس کا طرز عمل کچھ اور ہو گا۔ وقس علیٰ ہذا۔

اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ باری تعالیٰ کی جو صفات ہم مانتے ہیں ان کے لئے دلیل کیا ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ اس کی دلیل اتنی روشن ہے کہ آنکھ کھولتے ہی نظر آ سکتی ہے بشرطیکہ بینائی ہو اور بینائی کا رشتہ مرکز فہم وادراک سے ٹوٹ نہ گیا ہو۔

آپ کے سامنے ایک کرسی رکھی ہے۔ اس کا بنانے والا آپ کے سامنے نہیں ہے مگر آپ محض کرسی کو دیکھ کر اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ اس کو بنانے والے میں حیات، قدرت، ارادہ، بصارت، حس، شعور، حکمت وغیرہ ضرور موجود ہوں گی ورنہ وہ اس کرسی کو نہیں بنا سکتا تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ صانع کی صفات کو جاننے کے لئے اس کی صنعت کو دیکھنا اور غور کرنا کافی ہے۔ اب یہ عظیم الشان کارخانہ جس کا نام کائنات ہے

آپ کے سامنے کھلا ہوا ہے اور ہر آن نت نئی شان سے چل رہا ہے۔ اس کو دیکھئے اور اس میں تفکر کیجئے۔ آپ کا دل خود ہی گواہی دے گا کہ اس کے صانع میں فلاں اور فلاں صفات کا ہونا ضروری ہے۔ بعض صفات بالکل صریح طور پر اول نظر میں معلوم ہوجاتی ہیں، مثلاً ربوبیت، حکمت، علم، قدرت وغیرہ۔ بعض صفات تھوڑے یا بہت تامل سے سمجھ میں آتی ہیں، مثلاً رحمانیت۔ اور بعض صفات ایسی ہیں جن کے متعلق مشاہدہ اور تفکر کے بعد بھی علم یقین حاصل نہیں ہوتا۔ اس علم یقین کے حصول کا ذریعہ نبی صادق کی خبر کے سوا کوئی نہیں۔ مثلاً باری تعالیٰ کا دیّان (جزا دینے والا) ہونا، کہ جب تک نبی صادق اس کی خبر نہ دے، بڑے سے بڑا صحیح الفکر آدمی بھی اس کے متعلق حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آثار کا مشاہدہ اور تفکر فی خلق السموات والارض زیادہ سے زیادہ اسے امکان دینونت تک، یا حدِ حد رجحان دینونت تک لے جاکر چھوڑ دیتا ہے۔ وہ آفاق و انفس میں خدا کی کاریگری کے نشانات دیکھ کر اس حد تک تو کہہ سکے گا کہ ایسی حکمت کے ساتھ جس نے ہمیں بنایا ہے اس کا فعل عبث تو نہیں ہوسکتا۔ ممکن ہے کہ اس زندگی کے ختم ہونے پر وہ ہمارے کارنامۂ حیات کا حساب لے اور جزا و سزا دے، اور اغلب ہے کہ ایسا ہو۔ لیکن اس اعتقاد کا جزم و یقین، اور حساب و کتاب کی کیفیت کا صحیح علم مجرد تفکر سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے نبی کی ہدایت ناگزیر ہے۔

خطباتِ جمعہ

خطبہ صیام

الحمد للہ، نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ۔ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا وسیاٰت اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ واشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ۔ واشھد ان سیدنا محمداً عبدہ ورسولہ۔

ہر تعریف اللہ کے لئے ہے اور اللہ ہی کو پہنچتی ہے۔ ہم اس کی حمد وثنا کرتے ہیں، اسی سے مدد مانگتے ہیں، اس سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں؛ اس پر ایمان لاتے ہیں، اور اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ہم کو خود اپنے نفس کی شرارتوں اور اعمال کی برائیوں سے بچائے۔ اللہ جس کو ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا، اور اللہ ہی جس کو ہدایت نہ دے اسے کوئی سیدھے رستے پر نہیں لگاسکتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اس اکیلے خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور کوئی اس کا شریک نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ ہمارے آقا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

برادرانِ اسلام! ہر کام جو انسان کرتا ہے، اس میں دو چیزیں لازمی طور پر ہوا کرتی ہیں۔ ایک چیز تو وہ مقصد ہے جس کے لئے کام کیا جاتا ہے، اور دوسری چیز وہ خاص صورتِ عمل ہے جو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اختیار کی جاتی ہے۔ مثلاً کھانا کھانے کے فعل کو لیجئے۔ کھانے سے آپ کا مقصد زندہ

رہنا اور جسم کی طاقت کو بحال رکھنا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کی صورت یہ ہے کہ آپ نوالے بناتے ہیں، منہ میں لے جاتے ہیں، دانتوں سے چباتے ہیں اور حلق کے نیچے اتارتے ہیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے سب سے زیادہ کارگر اور سب سے زیادہ مناسب طریقہ یہی ہو سکتا تھا، اس لئے آپ نے اسی کو اختیار کیا، لیکن آپ میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ اصل چیز وہ مقصد ہے جس کے لئے کھانا کھایا جاتا ہے، نہ کہ کھانے کے فعل کی صورت۔ اگر کوئی شخص لکڑی کا برادہ یا راکھ یا مٹی لے کر اس کے نوالے بنائے اور منہ میں لے جائے اور دانتوں چبا کر حلق کے نیچے اتارے تو آپ اسے کیا کہیں گے؟ یہی نا کہ اس کا دماغ خراب ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ احمق کھانے کے اصل مقصد کو نہیں سمجھتا اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ بس فعل خوردن کے ان چاروں ارکان کو ادا کر دینے ہی کا نام کھانا کھانا ہے۔ اسی طرح آپ اس شخص کو بھی پاگل قرار دیں گے جو روٹی کھانے کے بعد فوراً ہی حلق میں انگلی ڈال کر قے کر دیتا ہو اور پھر شکایت کرتا ہو کہ روٹی کھانے کے جو فائدے بیان کئے جاتے ہیں وہ تو مجھے حاصل ہی نہیں ہوتے، بلکہ میں تو الٹا روز بروز دبلا ہوتا جا رہا ہوں اور مر جانے کی نوبت آ گئی ہے۔ یہ احمق اپنی اس کمزوری کا الزام روٹی اور کھانے پر رکھتا ہے، حالانکہ حماقت اس کی اپنی ہے۔ اس نے اپنی نادانی سے یہ سمجھ لیا کہ کھانے کا فعل جتنے ارکان سے مرکب ہے بس ان کو ادا کر دینے ہی سے زندگی کی طاقت حاصل ہو جاتی ہے، اس لئے اس نے سوچا کہ اب روٹی کا بوجھ اپنے معدے میں کیوں رکھوں؟ کیوں نہ اسے نکال پھینکا جائے تاکہ پیٹ ہلکا ہو جائے، کھانے کے ارکان تو میں ادا کر ہی چکا ہوں۔ یہ احمقانہ خیال جو اس نے قائم کیا اور اس کی پیروی کی اس کی سزا بھی ظاہر ہے کہ اسی کو بھگتنی چاہئے۔ اس کو جاننا چاہئے تھا کہ جب تک روٹی پیٹ میں جا کر ہضم نہ ہو، اور خون بن کر سارے جسم میں پھیل نہ جائے، اس وقت تک زندگی کی طاقت حاصل نہیں ہو سکتی۔ کھانے کے ظاہری ارکان بھی اگرچہ ضروری ہیں، کیونکہ ان کے بغیر روٹی معدے تک نہیں پہنچ سکتی، مگر محض ان ظاہری ارکان سے کام نہیں چل سکتا۔ ان ارکان میں کوئی جادو بھرا ہوا نہیں ہے کہ انہیں ادا کرنے سے بس طلسماتی طریقہ پر آدمی کی رگوں میں خون دوڑنے لگتا ہو۔ خون پیدا کرنے کے لئے تو اللہ نے

جو قانون بنایا ہے اسی کے مطابق وہ پیدا ہوگا۔ اس کو توڑو گے تو اپنے آپ کو خود ہلاک کرو گے۔

یہ مثال جو اس تفصیل کے ساتھ میں نے آپکے سامنے بیان کی ہے اس پر آپ غور کریں تو آپ کی سمجھ میں آسکتا ہے کہ آج آپ کی عبادتیں کیوں بے اثر ہوگئی ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بھی آپسے بارہا بیان کر چکا ہوں سب سے بڑی غلطی یہی ہے کہ آپنے نماز روزے کے ارکان اور ان کی ظاہری صورتوں ہی کو اصل عبادت سمجھ رکھا ہے اور آپ اس خیال خام میں مبتلا ہوگئے ہیں کہ جس نے یہ ارکان پوری طرح ادا کر دیئے اس نے بس اللہ کی عبادت کر دی۔ آپ کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کھانے کے چاروں ارکان، یعنی نوالے بنانا، منہ میں رکھنا، چبانا، اور حلق کے نیچے اتار دینا، بس انہی چاروں کے مجموعے کو کھانا سمجھتا ہے، اور یہ خیال کرتا ہے کہ جس نے یہ چار ارکان ادا کر دیئے اس نے کھانا کھالیا اور کھانے کے فائدے اس کو حاصل ہونے چاہئیں، خواہ اس نے ان ارکان کے ساتھ مٹی اور پتھر اپنے پیٹ میں اتارے ہوں، یا روٹی کھا کر فوراً قے کر دی ہو۔ اگر حقیقت میں آپ لوگ اس حماقت میں مبتلا نہیں ہوگئے ہیں تو مجھے بتائیے یہ کیا ماجرا ہے کہ جو روزہ دار صبح سے شام تک برابر اللہ کی عبادت میں مشغول ہوتا ہے وہ اس عبادت کی حالت میں جھوٹ کیسے بولتا ہے؟ غیبت کس طرح کرتا ہے؟ اس کی زبان سے گالیاں کیوں نکلتی ہیں؟ وہ عین عبادتِ الٰہی کی حالت میں لوگوں کے حق کیسے مار کھاتا ہے؟ حرام کھانے اور حرام کھلانے کا کام کس طرح کر لیتا ہے؟ اور پھر یہ سب کام کر کے بھی اپنے نزدیک یہ کیسے سمجھتا ہے کہ میں نے خدا کی عبادت کی ہے۔ کیا اس کی مثال اس شخص کی سی نہیں ہے جو راکھ اور مٹی کھاتا ہے اور محض کھانے کے چار ارکان ادا کر دینے کو سمجھتا ہے کہ کھانا اسی کو کہتے ہیں۔ پھر مجھے بتائیے یہ کیا ماجرا ہے کہ رمضان بھر میں تقریباً ۳۶۰ گھنٹے خدا کی عبادت کرنے کے بعد جب آپ فارغ ہوتے ہیں تو اس پوری عبادت کے تمام اثرات شوال کی پہلی تاریخ ہی کو کافور ہو جاتے ہیں۔ ہندو اپنے تہواروں میں جو کچھ کرتے ہیں وہی سب آپ عید کے زمانے میں کرتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ شہروں میں تو عید کے روز بدکاری اور شراب نوشی اور

قمار بازی تک ہوتی ہے۔ اور بعض ظالم تو میں نے ایسے دیکھے ہیں جو رمضان کے زمانے میں دن کو روزہ رکھتے ہیں اور رات کو شراب پیتے اور زنا کاری کرتے ہیں۔ عام مسلمان خدا کے فضل سے اس قدر بگڑے ہوئے تو نہیں ہیں، مگر رمضان ختم ہونے کے بعد آپ میں سے کتنے ایسے ہیں جن کے اندر عید کے دوسرے دن بھی تقویٰ اور پرہیزگاری کا کوئی اثر باقی رہتا ہو؟ خدا کے قوانین کی خلاف ورزی میں کونسی کسر اٹھا رکھی جاتی ہے؟ نیک کاموں میں کتنا حصہ لیا جاتا ہے؟ اور نفسانیت میں کیا کمی آجاتی ہے؟ سوچئے اور غور کیجئے کہ اس کی وجہ آخر کیا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ کے ذہن میں عبادت کا مفہوم اور مطلب ہی غلط ہو گیا ہے۔ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ سحر سے لے کر مغرب تک کچھ نہ کھانے اور نہ پینے کا نام روزہ ہے اور بس یہی عبادت ہے۔ اس لئے روزے کی تو آپ پوری حفاظت کرتے ہیں۔ خدا کا خوف آپ کے دل میں اس قدر ہوتا ہے کہ جس چیز میں روزہ ٹوٹنے کا ذرا سا اندیشہ بھی ہو اس سے بھی بچتے ہیں۔ اور اگر جان پر بھی بن جائے تب بھی آپ کو روزہ توڑنے میں تامل ہوتا ہے لیکن آپ یہ نہیں جانتے کہ یہ بھوکا پیاسا رہنا اصل عبادت نہیں بلکہ عبادت کی صورت ہے۔ اور یہ صورت مقرر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ آپ کے اندر خدا کا خوف اور خدا کی محبت پیدا ہو، اور آپ کے اندر اتنی طاقت پیدا ہو جائے کہ جس چیز میں دنیا بھر کے فائدے ہوں مگر خدا ناراض ہوتا ہو اس سے آپ اپنے نفس پر جبر کر کے بچ سکیں، اور جس چیز میں طرح طرح کے خطرات اور نقصانات ہوں مگر خدا اس سے خوش ہوتا ہو، اس پر آپ اپنے نفس کو مجبور کر کے آمادہ کر سکیں۔ یہ طاقت اسی طرح پیدا ہو سکتی تھی کہ آپ روزے کے مقصد کو سمجھتے اور مہینہ بھر تک آپ نے خدا کے خوف اور خدا کی محبت میں اپنے نفس کو خواہشات سے روکنے اور خدا کی رضا کے مطابق چلانے کی جو مشق کی ہے اس سے کام لیتے مگر آپ تو رمضان کے بعد ہی اس مشق کو اور ان صفات کو جو اس مشق سے پیدا ہوتی ہیں اس طرح نکال پھینکتے ہیں جیسے کھانا کھانے کے بعد کوئی شخص انگلی ڈال کر قے کر دے۔ بلکہ آپ میں سے بعض لوگ تو روزہ کھولنے کے بعد ہی دن بھر کی پرہیزگاری کو اگل دیتے ہیں۔ پھر آپ ہی بتائیے کہ رمضان اور اس کے روزے کوئی

طلسم تو نہیں ہیں کہ بس ان کی ظاہری شکل پوری کر دینے سے آپ کو وہ طاقت حاصل ہو جائے جو حقیقت میں روزے سے حاصل ہونی چاہئے۔ جس طرح روٹی سے جسمانی طاقت اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ وہ معدے میں جا کر ہضم نہ ہو اور خون بن کر جسم کی رگ رگ میں نہ پہنچ جائے، اسی طرح روزے سے بھی روحانی طاقت اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ آدمی روزہ کے مقصد کو پوری طرح سمجھے نہیں اور اپنے دل و دماغ کے اندر اس کو اترنے اور خیال، نیت، ارادہ اور عمل سب پر چھا جانے کا موقع نہ دے۔

یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ کا حکم دینے کے بعد فرمایا لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ۔ یعنی تم پر روزہ فرض کیا جاتا ہے، شاید کہ تم متقی و پرہیزگار بن جاؤ۔ یہ نہیں فرمایا کہ اس سے تم ضرور متقی و پرہیزگار بن جاؤ گے۔ اس لئے کہ روزے کا یہ نتیجہ تو آدمی کی سمجھ بوجھ اور اس کے ارادے پر موقوف ہے۔ جو اس کے مقصد کو سمجھے گا اور اس کے ذریعہ سے اصل مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرے گا وہ تو تھوڑا یا بہت متقی بن جائے گا۔ مگر جو مقصد ہی کو نہ سمجھے گا اور اسے حاصل کرنے کی کوشش ہی نہ کرے گا اسے کوئی فائدہ حاصل ہونے کی امید نہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے روزے کے اصل مقصد کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور یہ سمجھایا ہے کہ مقصد سے غافل ہو کر بھوکا پیاسا رہنا کچھ مفید نہیں۔ چنانچہ فرمایا:-

من لم یدع قول الزور والعمل بہ فلیس للہ حاجۃ فی ان یدع طعامہ وشرابہ	جس نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو اس کا کھانا اور پانی چھڑوا دینے کی اللہ کو کوئی حاجت نہیں ہے۔

دوسری حدیث میں ہے کہ سرکار نے فرمایا:-

کم من صائم لیس لہ من صیامہ الا الظمأ وکم من قائم لیس لہ من قیامہ الا السہر۔	بہت سے روزہ دار ایسے ہیں کہ روزے سے بھوک پیاس کے سوا ان کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ اور بہت سے راتوں کو کھڑے رہنے والے ایسے ہیں کہ اس قیام سے رت جگے کے سوا ان کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔

ان دونوں حدیثوں کا مطلب بالکل صاف ہے۔ ان سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ محض بھوکا اور

پیاسا رہنا عبادت نہیں ہے، بلکہ اصل عبادت کا ذریعہ ہے، اور اصل عبادت ہے خوف خدا کی بنا پر اس کے قانون کی خلاف ورزی سے بچنا، اور محبت الٰہی کی بنا پر ہر اس کام کے لئے شوق سے لپکنا جس میں محبوب کی خوشنودی ہو، اور نفسانیت سے بچنا جہاں تک بھی ممکن ہو۔ اس عبادت سے جو شخص غافل رہا اس نے خواہ مخواہ اپنے پیٹ کو بھوک پیاس کی تکلیف دی۔ اللہ تعالیٰ کو اس کی حاجت کب تھی کہ بارہ چودہ گھنٹے کے لئے اس سے کھانا پینا چھڑوا دیتا۔

روزے کے اصل مقصد کی طرف سرکار اس طرح توجہ دلاتے ہیں کہ:۔

من صام رمضان ایمانًا واحتسابًا غفر له ما تقدم من ذنبه

جس نے روزہ رکھا ایمان اور احتساب کے ساتھ اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیئے گئے۔

ایمان کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے متعلق ایک مسلمان کا جو عقیدہ ہونا چاہئے وہ عقیدہ ذہن میں پوری طرح تازہ رہے۔ اور احتساب کا یہ مطلب ہو کہ آدمی ہر وقت اپنے خیالات اور اپنے اعمال پر نظر رکھے کہ کہیں وہ اپنے ایمان کے خلاف تو نہیں چل رہا ہے۔ ان دونوں چیزوں کے ساتھ جو شخص رمضان کے پورے روزے رکھ لے گا وہ اپنے پچھلے گناہ بخشوا لے جائے گا اس لئے کہ اگر وہ کبھی سرکش و نافرمان بندہ تھا بھی تو اب اس نے اپنے مالک کی طرف پوری طرح رجوع کر لیا، اور التائب من الذنب کمن لا ذنب له۔

دوسری حدیث میں آیا ہے:۔

الصیام جُنّة واذا کان یوم صوم احدکم فلا یرفث ولا یصخب۔ فان سابّه احد او قاتله فلیقل انی امرؤ صائم	روزے ڈھال کی طرح ہیں کہ جس طرح ڈھال دشمن کے وار سے بچنے کے لئے ہے اسی طرح روزہ بھی شیطان کے وار سے بچنے کے لئے ہے۔ لہٰذا جب کوئی شخص روزے سے ہو تو

اسے چاہئے کہ اس ڈھال کو استعمال کرے اور دنگے فساد سے پرہیز کرے۔ اگر کوئی اس کو گالی دے یا اس سے لڑے تو اس کو کہہ دینا چاہئے کہ بھائی میں روزے سے ہوں۔ مجھ سے تم یہ توقع نہ رکھو کہ تمہارے اس مشغلہ میں حصہ لوں گا۔

دوسری احادیث میں حضور نے بتایا ہے کہ روزے کی حالت میں آدمی کو زیادہ سے زیادہ نیک کام کرنے چاہئیں اور ہر بھلائی کا شوقین بن جانا چاہئے۔ خصوصاً اس حالت میں اس کے اندر اپنے دوسرے بھائیوں کی ہمدردی کا جذبہ تو پوری شدت کے ساتھ پیدا ہو جانا چاہئے، کیونکہ وہ خود بھوک پیاس کی تکلیف میں مبتلا ہو کر زیادہ اچھی طرح محسوس کر سکتا ہے کہ دوسرے بندگانِ خدا پر غریبی اور مصیبت میں کیا گزرتی ہو گی۔ حضرت ابن عباس کی روایت ہے کہ خود سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں عام دنوں سے زیادہ رحیم اور شفیق ہو جاتے تھے۔ کوئی سائل اس زمانے میں حضور کے دروازے سے خالی نہ جاتا۔ اور کوئی قیدی اس زمانے میں قید نہ رہتا تھا۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضور نے فرمایا۔

من فطر فیہ صائماً کان لہ	جس نے رمضان میں کسی روزہ دار کو افطار کرایا تو یہ اس کے
مغفرۃً لذنوبہ وعتق رقبتہ من	گناہوں کی بخشش کا اور اس کی گردن کو آگ سے چھڑانے
النار وکان لہ مثل اجرہ من غیر ان	کا ذریعہ ہوگا اور اس کو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا
ینتقص من اجرہ شیٔ۔	اس روزہ دار کو روزہ رکھنے کا ثواب ملے گا۔

خطبۂ ثانیہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ۔

معاشر مسلمین! اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا احسان ہم پر یہ ہے کہ اس نے ہم کو اسلام کی نعمت سے نوازا، اور اسلام کی نعمت ہم کو جس ذریعہ سے پہنچی ہے وہ اللہ کے رسول برحق کی ذات ہے۔ لہٰذا جس طرح ہم پر اللہ کا شکر اور اس کی حمد و ثنا واجب ہے، اسی طرح اللہ کے رسول پر صلوۃ و سلام بھیجنا بھی واجب ہے۔ اللّٰھمّ صل علیٰ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ ال محمد کما صلیت علیٰ ابراھیم وعلیٰ ال ابراھیم انک حمیدٌ مجیدٌ۔ اس کے بعد ہمیں دعائے رحمت کرنی چاہئے حضور کے اصحاب و اہل بیت پر، اور خصوصاً آپ کے خلفائے راشدین حضرات ابوبکر صدیق و عمر بن الخطاب و عثمان ابن عفان و علی ابن ابی طالب پر کہ یہی حضرات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح پیروی کر کے ہمارے لئے ایک روشن راستہ چھوڑ گئے ہیں۔

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ۔

اس کے بعد دعا کیجئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہم کو راہ راست پر قائم رکھے اور گمراہی سے بچائے۔ خدایا ہمیں حق کو حق کرکے دکھا اور اس کی پیروی کی توفیق دے۔ اور ہمیں باطل کو باطل کرکے دکھا اور اس سے بچنے کی توفیق دے۔ خدایا جو تیرے دین کی مدد کرے تو اس کی مدد کر اور ہمیں اس کا ساتھی بنا۔ اور جو تیرے دین سے مُنہ پھیرے تو بھی اس سے منہ پھیر لے اور ہمیں اس کے فتنہ میں پڑنے سے بچا۔ خدایا! دنیا میں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔ بر و بحر میں فساد پھوٹ پڑا ہے، ایک تلاطم ہے جس میں تیرا نام لینے والوں کی ٹوٹی ہوئی کشتی تھپیڑے کھا رہی ہے۔ خدایا! تو ہی ہم کو علم کا نور دینے والا ہے کہ سیدھا راستہ دیکھ سکیں اور تو ہی ہمیں طاقت بخشنے والا ہے کہ اس طوفان سے صحیح وسالم بچ کر نکل سکیں۔ خدایا! تیرا ہی وعدہ ہے کہ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ۔ لہٰذا ہم تجھ سے دعا کرتے ہیں اور تو اسے قبول کر! رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔

عباد اللّٰہ! انّ اللّٰہ یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ وینھیٰ عن الفحشآء والمنکر والبغی۔ یعظکم لعلکم تذکرون۔ اذکروا اللّٰہ یذکرکم وادعوہ یستجب لکم۔ ولذکر اللّٰہ تعالیٰ اعلیٰ واولیٰ واعزّ واجل واھم واتم واقویٰ واکبر۔

مطبوعات

مقالات شبلی حصہ چہارم، حصہ پنجم، حصہ ششم، حصہ ہفتم تالیفات مولانا شبلی مرحوم۔ ضخامت بالترتیب ۱۸۹، ۱۳۸، ۲۴۰، ۲۰۰ صفحات قیمت عہ، عہ، عہ، عہ ملنے کا پتہ:۔ دار المصنفین اعظم گڈہ

مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے مستقل تصانیف کے علاوہ مختلف عنوانوں پر متعدد مضامین نکلے تھے، جن میں سے اکثر الندوہ میں شائع ہوئے تھے۔ مولانا مرحوم کا محققانہ اصول نگارش جس طرح ان کی مستقل تصنیفات میں نمایاں ہے، اسی طرح ان کے متفرق مضامین میں بھی موجود ہے۔ ادارہ دار المصنفین، جو مرحوم ہی کی یادگار ہے، ان قابل قدر علمی جواہر پاروں کو جو مختلف مقامات میں بکھرے پڑے تھے حسن ترتیب کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کر رہا ہے۔ اب تک اس سلسلہ کی سات جلدیں نکل چکی ہیں۔ آخر کی چار جلدیں اس وقت زیر تبصرہ ہیں۔

حصہ چہارم تنقیدی مباحث پر مشتمل ہے۔ سترہ کتابوں پر تفصیلی تبصرے ہیں۔ ان کتابوں میں اکثر وہ بلند پایہ اسلامی تصنیفات ہیں جو آج یورپ کی بدولت ہر گلی کوچے میں پھیل چکی ہیں، لیکن نصف صدی پیشتر تک خود مسلمان ان کے نام سے بھی بہت کم واقف تھے۔ اگرچہ ان مقالات کی حیثیت محض تبصروں کی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بجائے خود مفید، مدلل اور پر از معلومات مضامین ہیں۔ اور مولانا کا کمال خاص یعنی ان کا ذوق تنقیدی تو ایک ایک فقرہ میں جھلک رہا ہے۔ بالخصوص تمدن اسلام کے مصنف جرجی زیدان نے اپنی کتاب میں جن متعصبانہ عیاریوں سے اسلام کی مدح کے پردہ میں تنقیص کی تھی، اور جس کی نظر فریبی اچھے اچھے

دیدہ وروں کو جو کام دے گئی تھی، ان کی پردہ دری نہایت بالغ نظری سے کی گئی ہے۔

حصہ پنجم تاریخ و سیر سے متعلق ہے۔ اس میں مشاہیر اسلام کے سوانح حیات ہیں۔ تاریخ مولانا مرحوم کا خاص فن تھا، اس لئے ان مضامین کی نسبت کسی تفصیلی اظہار رائے کی ضرورت نہیں۔ معتزلہ اور اعتزال کی تاریخ بیان کرتے ہوئے جگہ جگہ مصنف نے "اعتزال" کو "عقلیت" سے تعبیر کیا ہے مگر یہ تعبیر ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ اعتزال کو نہ تو خالص اسلامی عقلیت کہا جا سکتا اور نہ یونانی۔ بلکہ یہ بین بین کی ایک خام فلسفیت ہے جس میں ایک طویل عرصہ تک مسلمان معقولیین اس وقت تک بھٹکتے رہے جب تک علوم عقلیہ نے ان کے اندر پختگی حاصل نہ کرلی۔ قریبی دور میں جس طرح یورپ کے علوم عقلیہ کی نئی نئی چمک دمک دیکھ کر ہماری آنکھیں خیرہ ہوئی تھیں، اور اب آہستہ آہستہ ان علوم کی گہرائیوں تک پہنچ کر یہ خیرگی دور ہو رہی ہے، اسی طرح ابتدائی زمانہ میں بھی جب مسلمان نئے نئے فلسفہ یونان و عجم سے واقف ہوئے تھے تو ان پر یہی خیرگی کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی، اور وہ کہیں صدیوں میں جا کر دور ہوئی۔ لہٰذا اگر نئے دور کے اعتزال کو حقیقی معنوں میں "عقلیت" سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا تو پرانے زمانے کا اعتزال بھی اس نام کا مستحق نہیں۔

اسی طرح ایک موقع پر ضمناً مصنف کے بعض بیانات سے اس خیال کی تائید نکلتی ہے کہ اسلامی علوم کا اصلی سرچشمہ یونانی زبان ہے ہمیں اس عمومی فیصلہ کے تسلیم کرنے میں تامل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ارتقاء تہذیب کی تاریخ میں ہر بعد کی قوم نے پہلے کی قوموں کے کارناموں سے استفادہ کیا ہے اور یہ استفادہ کوئی عیب نہیں ہے مسلمانوں نے بھی جب اس راہ میں قدم رکھا تو اقوام قدیمہ کے کارناموں سے استفادہ کیا۔ مگر مسلمانوں کا اصلی عطیہ (CONTRIBUTION) جس نے افکار انسانی کی رَو کو خیالیت سے واقعیت کی طرف پھیر دیا، اور خرص و تخمین سے ہٹا کر تحقیق کی طرف متوجہ کیا، اس کا سرچشمہ بجز قرآن حکیم کے کوئی نہیں۔ اس کا نشان ان سے پہلے کی کسی قوم کے علوم میں نہیں ملتا۔

حصہ ششم بھی تاریخی مقالات کا مجموعہ ہے، جن میں عام تاریخی مباحث پر سیر حاصل بحثیں کی گئی ہیں۔

یونانی، فارسی، ہندی وغیرہ غیر زبانوں کا قدیم لٹریچر جس طرح عربی زبان کے دامن میں آکر مسلمانوں کے ہاتھوں زندۂ جاوید ہوگیا، اس کی مفصل تاریخ ۱۱۲ صفحوں میں موجود ہے۔ اس سے مسلمانوں کی علم دوستی اور غیر عربی علوم کے ساتھ غیر متعصبانہ رغبت و اعتنا، کا حال معلوم ہوسکتا ہے۔ یورپ کی ان افترا پردازیوں میں سے جنھیں اس کے متعصب دماغ نے گھڑ کر مسلمانوں کو بدنام کیا ہے، ایک کتب خانۂ اسکندریہ کے جلائے جانے کا واقعہ بھی ہے۔ مولانا مرحوم نے اس سراپا غلط الزام کی پوری قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ اس مجموعہ میں سات مباحث ہیں اور ساتوں اسلامی تاریخ کی جان ہیں۔

جلد ہفتم میں فلسفیانہ مقالے ہیں۔ مسلمانوں کے متعلق یورپین ججوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ فلسفہ میں ارسطو کی گاڑی کے قلی تھے، فلسفۂ یونان کی کورانہ تقلید ان کے فلسفہ کا آخری زینہ ہے۔ مولانا نے تاریخی حقائق سے اس بے بنیاد ادّعا کی تردید کی ہے، اور بتایا ہے کہ مسلمانوں نے فلسفۂ یونان کو کس طرح محفوظ کیا؟ اس میں کیا اصلاح و ترمیم کی؟ اس پر کس قدر اضافے کئے؟ اس کے ساتھ انھوں نے خود یونانی منطق پر ـــ جس کے ساتھ ہمارے علما اب تک چمٹے ہوئے ہیں ـــ مجتہدانہ تنقید کرکے اس کی غلطیاں دکھائی ہیں، اور بتایا ہے کہ فلسفۂ اسلام، فلسفۂ یونان اور فلسفۂ جدیدہ کا درمیانی واسطہ ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ اسلامی فلسفہ ہی نے حکمتِ یونان کو ترقی کی منزلیں طے کرا کے اس مقام تک پہنچایا جہاں سے فلسفۂ حال کی داغ بیل پڑی۔

فلسفہ کے مختلف ادوار و مدارج کے متعلق مصنف کا یہ ریمارک یہاں تک تو بالکل واقعیت پر مبنی ہے۔ لیکن اس کے بعد انھوں نے جو قدم اٹھایا ہے اس میں جگہ جگہ فلسفۂ یورپ کے مقابلہ میں اس ذہنی مرعوبیت کے آثار دکھائی دیتے ہیں جو انیسویں صدی کے آخر میں تمام مسلمانوں پر چھا گئی تھی۔ بلاشبہ یورپین فلسفہ کی ابتدا اسلامی فلسفہ کی دست نگر ہے مگر آج وہ اپنی انتہا کو پہنچ کر اسلام سے اسی قدر دور ہوچکا ہے جس قدر یونانی فلسفہ تھا، بلکہ اصول و مبادی کے لحاظ سے اس سے بھی زیادہ۔ حکمتِ جدیدہ

کا نقطۂ آغاز خدا کو نہ ماننے کی خواہش ہے جو بجائے خود کسی علمی استدلال پر مبنی نہیں ہے بلکہ ایک بگڑی ہوئی ذہنیت اور ایک بھٹکے ہوئے رجحان نفس پر مبنی ہے۔ معقولات خالصہ ہوں یا نظری سائنس، دونوں کی بنیاد یہی چیز ہے، اور اسی خشتِ اوّل کی کجی نے ثریا تک اس دیوار کو کج کر کے رکھ دیا ہے۔ ڈارون کی تھیوری بھی جس کی مصنف نے دبی زبان سے تائید کی ہے دراصل اسی بنیاد پر مبنی ہے۔ اس نے آثار کائنات کا مشاہدہ اس مفروضہ کے ساتھ کیا کہ اس نظام کا کوئی بنانے اور چلانے والا نہیں ہے، اور پھر اس خواہش کے ساتھ تحقیق شروع کی کہ ایک صانع حکیم کے بغیر اس نظام کے چلنے کا معمہ حل کیا جائے، لہٰذا تمام علمی حقائق (SCIENTIFIC FACTS) جو اس کے سامنے آئے ان کو اس نے اس طور پر مرتب کر دیا کہ ان سے انواع کے خود بخود ایک نوع سے دوسری نوع میں تبدیل ہونے اور ترقی کرنے کا نتیجہ برآمد ہو۔ یہ نتیجہ بجائے خود علمی حقیقت نہیں ہے، بلکہ حقائق کی اس ترتیب سے پیدا ہوتا ہے جو خدا کو نہ ماننے کی مجرد خواہش پر مبنی ہے۔ مولانا مرحوم نے ڈارون کی تھیوری کو محض ارتقاء کی تھیوری سمجھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے کہ حکمائے اسلام بھی اس کے قائل تھے۔ مگر شاید یہ بات مرحوم کے علم میں نہ آئی کہ ڈارون کا اصلی کام نفس ارتقاء کا اثبات نہیں ہے بلکہ اس امر کا ادعا ہے کہ تنازع للبقاء اور انتخاب طبیعی اور بقائے اصلح کے قوانین کے تحت انواع خود بخود ایک دوسرے میں تبدیل ہوتی اور ترقی کرتی ہیں۔ حکمائے اسلام میں سے اس چیز کا نہ کوئی قائل ہوا، نہ کسی خدا پرست کا ذہن اس نظریہ کی طرف منتقل ہو سکتا ہے۔ اور نہ خود ڈارون اس کو علمی حقیقت ثابت کر سکا ہے۔ وہ جو کچھ علمی طور پر ثابت کر سکا ہے وہ صرف یہ ہے کہ عالم طبیعی میں یہ قوانین کام کر رہے ہیں، اور یہ کہ انواع میں ترتیب صعودی پائی جاتی ہے۔ رہا یہ کہ ان قوانین کے تحت نوع سافل سے نوع عالی کی طرف خود بخود صعود ہوتا ہے، تو یہ مجرد قیاس ہے۔ سائنٹفک حقیقت ثابت نہیں ہو سکا۔

قادیانی مذہب | تالیف جناب سلاح الدین محمد الیاس صاحب برنی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی علیگ ناظم سررشتہ تالیف و ترجمہ حیدر آباد۔ ضخامت ۱۱۰۰ صفحات، قیمت ہے، ملنے کا پتہ :- تاج کمپنی لاہور۔

ناظرین ترجمان القرآن اس کتاب کے نام سے ناواقف نہیں ہیں۔ ہم اس کے گذشتہ ایڈیشنوں پر برابر تبصرہ کرتے رہے ہیں۔ اب اسی کتاب کا پانچواں ایڈیشن شائع ہوا ہے جس میں کثرت سے نئے مباحث اور عبارات کا اضافہ کئے گئے ہیں۔ اور ان تمام قادیانی کتابوں کا جواب دے دیا گیا ہے جو اس کتاب کے سابقہ ایڈیشنوں کے رد میں شائع کی گئی ہیں۔ کتاب کی جامعیت، ترتیب کی خوبی، طرز بیان کی شگفتگی اور طریقۂ افہام و تفہیم کی جدت کا صحیح اندازہ پڑھنے ہی پر موقوف ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں قادیانیت اور بانی قادیانیت کا ایک ایک خط و خال بے حجاب نظر آتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس کتاب میں جو کچھ کہا گیا ہے، مرزا صاحب اور ان کے اصحاب کی زبان ہی سے کہا گیا ہے۔ یعنی قادیانیت کی کہانی خود اپنی زبانی ہے۔ قادیانیت گو اپنی موت آپ مر رہی ہے، پھر بھی ضرورت ہے کہ بے خبر مسلمانوں میں یہ کتاب کثرت سے پہنچے، اور لوگ اس فتنہ سے پرحذر رہیں۔ ہم خود اس فرقہ کے حق طلب طبقہ کی خدمت میں بھی مخلصانہ عرض کرتے ہیں کہ تعصب سے بالاتر ہو کر اس کتاب کو پڑھے لَعَلَّہٗ یَتَذَکَّرُ اَوْ یَخْشٰی۔

قادیانی قول و فعل | تالیف جناب پروفیسر صلاح الدین محمد الیاس صاحب برنی۔ ضخامت ۲۹۰ صفحات۔ قیمت ۱۲ / ملنے کا پتہ :- تاج کمپنی لاہور۔

اس کتاب کو کتاب "قادیانیت" کا تتمہ یا تشریحی خلاصہ کہنا چاہئے جو "قادیانی مذہب" کے جواب "بشارت احمد" کی تنقیح کے سلسلہ میں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب بھی اسی متانت، جامعیت اور تحقیق کی حامل ہے جس کی مولف سے توقع کی جا سکتی ہے۔ اس میں ان تمام عذرات اور بیجا تاویلات کا تشفی بخش جواب دے دیا گیا ہے جنھیں جناب بشارت احمد صاحب قادیانی نے اپنی کتاب میں پیش کیا تھا۔ قادیانی تحریک کی تدریجی قلابازیاں، قادیانی قول و فعل کی مبہم اور مغالطہ آمیز دورنگی، اور احمدیت کی اسلام کے خلاف خطرناک روش بلکہ سازش کا حال جن لوگوں کو نہ معلوم ہو وہ لوگ "قادیانی مذہب" کے ساتھ ساتھ اس کتاب کا بھی مطالعہ کریں۔ ان دونوں کتابوں میں فاضل مؤلف نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا ہے کہ امت قادیان کے ہاتھوں

میں اس کا اعمال نامہ۔ کامل اور مکمل اعمال نامہ جسے اس نے اپنے ہی قلم سے مرتب کیا ہے ـــــ دیباچہ
اور صرف اتنی گذارش کی ہے کہ اِقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا۔ کیا قادیانی
حضرات اس گذارش پر توجہ کریں گے ؟۔

ترجمان | مرتبہ سید معین الدین صاحب ایم اے۔ ضخامت ۳۲ صفحات، شرح چندہ سالانہ ۳؎۔ ملنے کا پتہ :۔ انجمن اتحادیہ مہاجرین بخارا و ترکستان گلی پہاڑی درزیاں، چتلی قبر، دہلی۔

روسی مظالم سے تنگ آ کر بخارا اور ترکستان کے مسلمان دنیا کے مختلف ممالک میں ہجرت کر رہے ہیں۔ اب تک تقریباً پچاس لاکھ مہاجرین اپنی متاع ایمان کی خاطر اپنے وطن کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔ ان میں سے ایک قافلہ ۱۰ اپریل ۱۹۳۷ء سے ہندوستان بھی آیا ہوا ہے۔ دہلی میں ان مہاجرین نے اپنی تنظیم کے لئے "انجمن اتحادیہ" کی بناڈالی ہے یہ ماہنامہ اسی انجمن کا آرگن ہے، جو چند ماہ سے نہایت کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ بعض مفید علمی و اصلاحی مضامین کے علاوہ جو چیز خاص طور سے قابل توجہ ہے وہ اشتراکی روس کی ہلاکت آفرینیوں اور فرزندان توحید کی خانہ بربادیوں کا وہ دل دوز مرقع ہے جسے یہ ستم زدہ مہاجرین اپنے قلم سے کھینچ رہے ہیں۔ دردمند مسلمانوں کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ اس رسالہ کی صدا زیادہ سے زیادہ کانوں تک پہنچائیں تاکہ ان فریب خوردوں کی آنکھوں سے پردہ ہٹ جائے جو اشتراکی نظام کو دنیا کے لئے رحمت سمجھ رہے ہیں اور جنھیں سویٹ روس کا جہنم زار جنت نشان نظر آرہا ہے۔ اس وقت انہیں معلوم ہوگا کہ ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے وہ جس نظام کی عدل پروری اور انسانیت نوازی کا دن رات قصیدہ پڑھا کرتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے اور جنھوں نے عملاً اسے دیکھا، بھگتا اور چکھا ہے وہ اس کا کیا حال بیان کرتے ہیں۔ توقع ہے کہ مسلمانان ہند اپنے مظلوم بھائیوں کے تجربہ اور مشاہدہ سے فائدہ اٹھائیں گے اور اشتراکی زہر کو اسلامی تریاق سمجھنے کی خطرناک غلطی نہ کریں گے۔ اس رسالہ میں روسی اور اشتراکی نظام کے متعلق جو کچھ شائع ہو رہا ہے نہ تو وہ کوئی پروپگنڈا ہے اور نہ اختلافِ نظریات کا اثر ہے بلکہ یہ لوگ خود دکھ کر

بھیدی ہیں، جیسا کچھ علمی دنیا میں انھوں نے اس نظام کو پایا ہے، بے کم و کاست بیان کر رہے ہیں۔ اس رسالہ کی توسیع اشاعت نہ صرف اخلاقی و علمی بلکہ دینی خدمت ہے فَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی۔ اگرچہ ان مہاجرین کو ہندوستان آئے ہوئے ابھی کل سال ڈیڑھ سال ہوئے ہیں لیکن انھوں نے اردو ادب میں حیرت انگیز مہارت پیدا کرلی ہے۔ اس لئے رسالہ کی ادبیت بھی زیادہ "بدلیشی" نہیں ہے ہمارے ترک بھائیوں کے لئے اسلام کی قومیت اور ملیت کافی ہے انھیں "چنگیز" جیسے فاتحوں پر فخر کرنے کی ضرورت نہیں۔

قائد | مرتبہ مولوی سید اختر اسلام صاحب قاسمی۔ ضخامت ۴۸ صفحات، قیمت سالانہ عمدہ کاغذ ۱۲ء معمولی کاغذ عہ۔ پتہ:۔ مولانا حکیم انظار احمد صاحب محلہ فیل خانہ، مراد آباد (یوپی)

یہ ایک علمی، مذہبی اور اقتصادی ماہنامہ ہے جو بعض اکابر دیوبند کی سرپرستی میں مراد آباد سے شائع ہو رہا ہے۔ رسالہ کی جامعیت قابل قدر ہے۔ اس کا نصب العین خود اسی کے لفظوں میں آنحضرت صلعم اور صحابہ کرام کے حالات پیش کرکے مسلمانوں کی اصلاح کرنا اور فلسفہ عروج و زوال پر بحث کرکے جذبات مسلم کو ابھارنا ہے، آخر میں ایک مضمون عربی زبان میں بھی شائع ہو رہا ہے۔ بہت سے مفید مضامین مسلسل شائع کئے جارہے ہیں۔ سیاسی مباحث بھی موجود ہیں مگر افسوس کہ کبھی کبھی متانت کا دامن ہاتھ سے چھوٹ بھی جاتا ہے۔ ایک ایسے رسالہ کو جو اسلامی تہذیب کا علمبردار اور "انسائیکلوپیڈیا" ہونے کا داعیہ رکھتا ہو کسی طرح زیب نہیں دیتا کہ عام اخباری لب و لہجہ اختیار کرے۔ مخالف بر سر غلط سہی لیکن لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ کی تعلیم غلط نہیں۔

فردوس | مرتبہ جناب حبیب اشعری صاحب دہلوی، ضخامت ۳۲ صفحات، قیمت عہ ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ فردوس، دہلی

سال رواں کے جدید ادبی ماہناموں اور شعر و ادب کے ممتاز خدمت گذاروں میں سے ہے۔

افسانے معیاری اور نتیجہ خیز ہیں"، "حبل القمر" کے عنوان سے جو افسانہ شائع ہوا ہے اس کی تلخ نگاری کچھ پسندیدہ نہیں۔ علماء سوکی بے اعتدالیوں کا ہم انکار نہیں کرتے مگر علماء کی پوری جماعت کو عمومی حیثیت سے اس بے اعتدالی کا مجرم کیوں ٹھہرایا جائے، اور وہ بھی ایسے غیر مہذب و سخیف انداز میں۔

کانگریس یا مسلم لیگ | تالیف جناب حکیم انصاری صاحب، ضخامت ۴۰ صفحات، قیمت ۲ر
ملنے کا پتہ :- ناظم دارالاشاعت سیاسیات مشرقیہ۔ آفندی لاج۔ قرولباغ۔ نئی دہلی۔

مسلمانوں کی جہالت اور مفلوج ذہنیت سے یورپ ایک مدت سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ہندی سیاست کے موجودہ انقلاب میں ہندو بھی مسلمانوں کے متعلق اسی داؤ سے کام لینا چاہتا ہے بلکہ کانگریس کے اسلحہ خانہ سے اس کا استعمال بھی شروع کر چکا ہے اور مسلم قوم ہے کہ ابھی تک کانگریس کے متعلق یہی طے نہیں کر سکی کہ اس میں مسیحائیت ہے یا دجالیت۔ یہ رسالہ اختصار کے باوجود اس مبحث پر ایک حقیقت افروز تبصرہ ہے جس میں مصنف نے نہایت سلجھے ہوئے اور دلنشیں پیرایہ میں، بصورتِ مکالمہ ان تمام غلط فہمیوں کی اصلیت آشکارا کر دی ہے جس میں ہمارا جوشیلا وطن پرست اور کانگریسی مسلمان مبتلا ہے۔ محض حقائق اور واقعات سے بحث کی گئی ہے۔ انداز بیان کی متانت اور شرافت نے اس رسالہ کی قیمت میں خاص اضافہ کر دیا ہے۔ جو سلیم الطبع مسلمان سیاست حاضرہ کی پیچیدگیوں کو سمجھنا چاہے اسے اس رسالہ کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔

مولف نے کانگریس پر اجمالاً تنقید کا پورا حق ادا کر دیا ہے لیکن مسلم لیگ سے انھوں نے کوئی خاص تعرض نہیں کیا ہے۔ مسلمانوں کی علحدہ تنظیم اور اتحاد کی ضرورت اور اس کے طریقہ کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، نہیں معلوم کوئی مدعی اسلام اس سے کیسے انکار کرے گا؟

آزادی کی جنگ | تالیف عبدالوحید خانصاحب بی، اے، ضخامت ۱۲۸ صفحات۔ قیمت ۸ر
ملنے کا پتہ :- عبدالوحید خانصاحب - ۹ لاٹوش روڈ لکھنؤ۔

یہ کتاب بھی سیاست حاضرہ سے تعلق رکھتی ہے جس میں فاضل مصنف نے نہایت کاوش کے ساتھ سیاسی معلومات کا ایک معقول ذخیرہ جمع کرکے کانگریس کے ادعائے آزادی کی حقیقت کھولی ہے اور کانگریسی قول و فعل کا ایک ایسا مرقع ہے جس میں کانگریس کی مہاسبھائیانہ ذہنیت اور اسلام دشمنی کا چہرہ بے حجاب نظر آتا ہے جو بات لکھی گئی ہے واقعات کی سند کے ساتھ۔ گو مولف کا خلوص آمیز جوش اور اسلامی غیرت ہر ہر فقرہ سے نمایاں ہے مگر باوجود اس کے قلم کہیں بھی حدود متانت سے متجاوز نہیں ہوا ہے۔ مولف مسلم لیگ کا پرجوش حامی ہے، اس لئے فطرتاً اس نے اس کے نقائص سے بحث نہیں کی ہے، حالانکہ یہ چیز بھی خاص توجہ کی مستحق ہے۔ اگر مسلم لیگ اپنی موجودہ کمزوریوں سے پاک ہوتی تو کانگریس کی فریب کاریاں کبھی بار آور ہونے کا حوصلہ نہ کرسکتیں۔ ہاں مولف کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ حریت پسند مسلمان لیگ پر قبضہ کرکے نہایت آسانی کے ساتھ اس کی اصلاح کرسکتے ہیں لیکن آج کا مسلمان جب دن کو رات کہہ دیتا ہے تو سورج اس کی نگاہوں سے چھپ جاتا ہے اور آسمان کے ہر گوشے میں ماہ و پرویں دیکھنے لگتا ہے۔

کتاب میں طباعت کی غلطیاں بہت زیادہ ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی ترتیب میں بھی اصلاح کی کافی گنجائش ہے اگر اس تمام مواد کو سائنٹفک طریقہ سے ترتیب دے کر بحث کو اوسلجھا دیا جائے تو کتاب کا معنوی حسن اور زیادہ جاذب نظر بن جائے گا۔

زبدۃ السیرۃ النبویہ | تالیف جناب مولانا عماد الدین صاحب انصاری ضخامت ۴۸ صفحات، قیمت ۳ر ملنے کا پتہ :- ناظم کتب خانہ انصاریہ جالندھر۔

یہ کتاب نبی مبتدیوں کے لئے لکھی گئی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ نہایت صاف اور سلیس عبارت میں پیش کی گئی ہے۔ نحو صرف کی ابتدائی کتابوں کے ساتھ اس کا پڑھایا جانا ایک طرف طلبہ کے لئے ادبی مشق کا کام دے گا دوسری طرف دنیا کے سب سے کامل انسان کی سیرت ان کے اخلاق کو سنوارے گی۔

Registered No. L. 4186

ذی الحجہ ۱۳۵۷ — جلد ۱۳ - عدد ۶

۸۶ء

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

ملتان روڈ، لاہور

قیمت سالانہ پانچ روپے — قیمت فی پرچہ ۸ آنے

فہرست مضامین

ماہ ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۳۹ء جلد ۱۳ عدد ۶

باہتمام سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر گیلانی الکٹرک پریس لاہور میں طبع ہو کر
دفتر ترجمان القرآن ملتان روڈ لاہور سے شائع ہوا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں کچھ مدت سے ایک مسودۂ قانون زیر بحث تھا جس میں مسلمان عورتوں کے لیے فسخ و تفریق کی کچھ آسانیاں تجویز کی گئی تھیں۔ اگرچہ اس مسودۂ قانون میں متعدد نقائص تھے، اور اب کہ وہ آخری بار اسمبلی میں منظور ہو کر نکلا ہے، اس کے نقائص پہلے سے بھی کچھ زیادہ بڑھ گئے ہیں، لیکن ہم نے اس پر کسی قسم کا اظہار رائے نہیں کیا۔ اس بنا پر نہیں کہ ہمیں عورتوں کی اصلاح حال سے، یا قانون اسلامی کے صحیح و مکمل نفاذ سے دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ محض اس بنا پر کہ ہم کسی مجلس قانون ساز کے اس حق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں کہ وہ شریعت اسلامی کی دفعات کو نافذ کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرے، یا قانونِ شریعت کی دفعات پر اس حیثیت سے بحث کرے کہ ان میں کیا چیز مناسب ہے اور کیا غیر مناسب، اور کسے نافذ کیا جائے اور کسے نہ کیا جائے۔ یہ حق خود مسلمانوں کی اپنی بنائی ہوئی کسی اسمبلی کو بھی نہیں ہے، کجا کہ انگریزوں کی بنائی ہوئی اسمبلی کو حاصل ہو، اور وہ بھی ایسی اسمبلی جس میں غیر مسلم اکثریت کے ووٹوں پر فیصلہ کا مدار ہو۔ قانون اسلامی کے متعلق اس قسم کے مسودات موجودہ حکومت کی بنائی ہوئی مجالس قانون ساز میں پیش کر کے خواہ چھوٹے چھوٹے فوائد کتنے ہی حاصل کر لیے جائیں، مگر سب سے بڑا اور سب سے زیادہ بھاری نقصان اس سے یہ پہنچتا ہے کہ ہم خدا اور اس کے رسول کے مقابلہ میں ووٹ اور رائے اور اپنی کے حق تشریع کو تسلیم کرتے ہیں۔ تمام دنیا کے فوائد اس نقصان عظیم کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ مسلمانوں کے گھروں کا تباہ ہو جانا اور ان کی ہستی کا مٹ جانا اس سے لاکھ درجہ بہتر ہے کہ مسلمان قرآن اور سنت کے احکام و قوانین کو غیر مسلم قانون سازوں کے سامنے نقد و تبصرے کے لیے پیش کریں، اور ان کے سامنے ہاتھ پھیلا کر بھیک مانگیں کہ اس قانون کی ـــــ جسے ہم قانون الٰہی بھی ساتھ ہی ساتھ کہتے جاتے ہیں ـــــ فلاں

فلاں دفعات کو ہمارے لیے قانون بنادو۔ پھر وہ منظر جبکہ ایک طرف مسلمان یہ بھیک کا ہاتھ پھیلائے ہوئے ہو، اور دوسری طرف وہ غیر مسلم لیجسلیٹر جو فیصلہ کا اختیار رکھتا ہے، اس کی آنکھوں کے سامنے شرعی قانون میں کانٹ چھانٹ کر رہا ہو، حقیقتاً ایسا منظر ہوتا ہے کہ اس کو دیکھنے سے پہلے مسلمان کا ڈوب مرنا زیادہ بہتر ہے!

یہ معاملہ کچھ اس قدر ایمان سوز اور غیرت شکن ہے کہ اس پر قلم اٹھاتے ہوئے روح کو اذیت ہوتی ہے۔ مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ عامیوں سے لے کر علمائے کرام تک نے اس مسودۂ قانون کو اسمبلی کے سامنے پیش کرنے میں دلچسپی لی ہے، اور اس پر اس طرح زور دیا ہے کہ گویا دین و دنیا کی فلاح اسی پر منحصر تھی، تو دل پر پتھر رکھ کر جی چاہتا ہے کہ اس آخری منظر کا نقشہ یہاں کھینچا جائے جو مسودہ کی منظوری سے پہلے ۱۴ فروری کو اسمبلی میں دیکھا گیا، شاید کہ اسی سے مسلمانوں کی سوئی ہوئی غیرت میں کچھ حرکت پیدا ہو۔

مولوی سید مرتضیٰ صاحب نے ترمیم پیش کی کہ خلع اور فسخ و تفریق کے مقدمات صرف مسلمان جج ہی کے سامنے پیش ہونے چاہئیں۔ اس پر حکومتِ ہند کے رکن قانون سر این این سرکار نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

> "مگر انتظامی مشکلات سے قطع نظر، حکومت ہند اس اصول ہی کو تسلیم نہیں کر سکتی کہ ایک خاص فرقہ کے مقدمات کی سماعت اسی فرقہ کے جج کیا کریں۔ اس سے دوسرے فرقوں کے ججوں کی عدالتی راستبازی پر حرف آتا ہے۔"

اس کے معنی و مفہوم پر غور کیجیے۔ جو حکومت اس اصول کو خود قائم کرتی رہی ہے کہ انگریز کے مقدمہ کی سماعت خود ہز مجسٹی کا مامور کردہ غیر انگریز جج بھی نہیں کر سکتا، جس حکومت نے اپنے حدود مملکت ہی میں نہیں بلکہ ٹرکی اور مصر اور چین کی حکومتوں کے دائرہ اختیار میں بھی مدتوں یہ اصول تسلیم کرایا کہ انگریزی قومیت والوں کے مقدمات غیر انگریزی عدالتوں میں پیش نہیں ہو سکتے، وہی حکومت ہم سے کہتی ہے کہ تمہارے شرعی مقدمات کے بارے میں یہ اصول تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ تمہاری ہی شریعت پر ایمان رکھنے والے ان کی سماعت کریں! تم کو اپنی عورتوں کے نکاح فسخ کرنے

اور تفریق بین المرء وزوجہ کے نازک معاملات بھی غیر مسلم ججوں کے سامنے پیش کرنے پڑیں گے، چاہے وہ تمہاری شریعت پر ایمان نہ رکھتے ہوں اور تعلقات زن و مرد کے متعلق ان کے نظریات تمہاری شریعت کے نظریات سے بالکل مختلف ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر تمہاری شریعت یہ کہتی ہے کہ فسخ نکاح اور تفریق بین الزوجین قاضی شرعی کے بغیر جائز نہیں، تو کہا کرے۔ اگر تمہارے دین کی رو سے غیر قاضی کے فسخ و تفریق کا اعتبار نہیں، اور اس طرح عورت کا نکاح ثانی درست نہیں ہوتا تو ہمیں اس کی کیا پروا۔ جب تم خود اپنی شریعت کو ہمارے سامنے فیصلہ کے لیے پیش کر رہے ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تم نے خود ہی اپنے خدا اور رسول کے بجائے ہم کو شارع تسلیم کیا ہے۔ لہذا ہمارے اصول تمہاری شریعت پر مقدم ہیں۔ تمہاری شریعت تابع ہے اور ہمارے اصول متبوع!

کاش یہی جواب سُن کر اسمبلی کے مسلمان ممبروں کی آنکھیں کھلتیں اور وہ اس مسودے کو لا ممبر کے منہ پر مار کر باہر نکل آتے۔

مگر اسمبلی کے مسلمان ممبر! یہ مردم شماری کے مسلمان، جن کو ہماری قوم اپنے ووٹوں سے منتخب کرکے، اپنا نمائندہ بنا کر بھیجتی ہے۔ ان کی دینی حمیت کے نمونے تو بارہا دیکھے جا چکے ہیں۔ مگر کبھی مسلمانوں کو احساس ہی نہ ہوا کہ ہم کس نادانی کے ساتھ اپنا ووٹ استعمال کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب، جناب آصف علی نے کانگریس پارٹی کی طرف سے اس ترمیم کی مخالفت کی۔ دوسرے بزرگ جناب عبدالقیوم نے فرمایا کہ "یہ ترمیم اصلاً غلط ہے۔ ملک میں پہلے ہی جو امتیازات (مثلاً ریلوے اسٹیشنوں پر ہندو پانی اور مسلمان پانی) پھیلے ہوئے ہیں، ان کو قانون کی سرحدوں تک ہیں نہ پہنچا دینا چاہیے"۔ یہ دونوں حضرات نیشنلسٹ مسلم جماعت کے گلہائے سرسبد اور "متحدہ قومیت" کے علمبردار ہیں۔ یہ کس طرح برداشت کر سکتے ہیں کہ مسلم و کافر کے امتیازات مٹنے کے بجائے اور بڑھیں، یہاں تک بڑھ جائیں کہ اسلامی شریعت کی تعبیر و تفسیر کا حق بھی غیر مسلم سے چھین لیا جائے! مسلمان عورت کا نکاح تک۔۔ غیر مسلم فسخ نہ کر سکے! "ہندو پانی" اور "مسلمان پانی" کی طرح "ہندو شاستری" اور "مسلم قاضی" کی آوازیں بھی آنے لگیں!

یہ اس "متحدہ قومیت" کی تفسیر ہے جس کے متعلق ہم کو قرآن و حدیث کی سند سے بتایا جاتا ہے کہ خدا بھی اس پر راضی ہے اور رسول کے عمل سے بھی ثابت ہے۔ "امۃ مع المومنین" والے معاہدہ کو پھر ذرا ملاحظہ فرما لیا جائے۔ کچھ اس قومیت کا پتہ نشان بھی وہاں ملتا ہے کہ نہیں؟

مسٹر اینی کانگریس نیشنلسٹ پارٹی کے لیڈر نے خوب کہا اور بالکل سچ کہا کہ:۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ان مقدمات کی سماعت کے لیے مسلمان جج پر کیوں اصرار کرتے ہیں۔ آپ خود ہی تو اسلامی پرسنل لا کے بجائے مجلس قانون ساز کا بنایا ہوا قانون وجود میں لا رہے ہیں۔ آپ ایک غیر دینی مجلس سے اسلامی قانون کی تعبیر اور اس کے اطلاق کا تصفیہ کرا رہے ہیں۔ اب اگر یہ مجلس قانون بنانے کا اختیار رکھتی ہے تو اس بات کا بھی اختیار رکھتی ہے کہ اس قانون کی تعبیر کا حق جن منصفوں کو چاہے دے، بلا اس لحاظ کے کہ ان کا عقیدہ کیا ہے۔"

یہ سیدھی اور صاف بات ایک غیر مسلم تو سمجھ گیا، مگر نہ سمجھے تو ہمارے وہ ماہرین قانون جنھوں نے مسودہ مرتب اور پیش فرمایا، اور وہ پیشوایانِ دین اور وہ علمبرداران حریت جنھوں نے انگریز کی قائم کی ہوئی غیر اسلامی مجلس آئین ساز کے سامنے اسلامی قانون کے نفاذ کی بھیک مانگنے کو نہ صرف جائز رکھا بلکہ اس کی پرزور حمایت کی۔

میں مانتا ہوں کہ شریعت کے قوانین پوری طرح نافذ نہ ہونے سے ہمارے معاملات بگڑ رہے ہیں، ہماری معاشرت اور ہمارے تمدن کا نظام مختل ہو رہا ہے، ہمارے گھر تک خراب ہو رہے ہیں۔ ہمیں شرعی قانون کے نفاذ کی بلاشبہ ضرورت اور سخت ضرورت ہے۔ مگر اس کی یہ کونسی صورت ہے کہ ہم خدا اور رسول کے قانون کو انگریزی اسمبلی کے سامنے پیش کریں، اور وہ جانچ پڑتال کے لیے سلکٹ کمیٹی کے حوالہ کیا جائے، اور اس کی دفعات پر کوئی سرکار، کوئی اینی، کوئی آصف علی، کوئی عبدالقیوم رد و قدح کرے، اور ان کی تشریح کی

بنا پر نہ کہ اللہ اور اس کے رسول کی تشریع کی بنا پر وہ قانون، قانون بنے؟ چھوڑیے غیرت اور حمیت کے سوال کو۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ سرکار اور یہ اپنی اور یہ آصف علی اور عبدالقیوم ہوتے کون ہیں کہ یہ اسلامی قانون بنائیں اور ان کا بنایا ہوا قانون مسلمانوں پر اسلامی قانون کی حیثیت سے نافذ ہو؟ اسلامی قانون تو وہی ہے جو صرف خدا اور اس کے رسول کی سینکشن سے قانون بنے۔ کسی عمرو زید کا بنایا ہوا قانون، خواہ اس کی دفعات لفظ بلفظ اسلامی قانون سے ملتی ہوئی کیوں نہ ہوں، اسلامی قانون نہیں ہوسکتا، جبکہ اس کا قانون ہونا خدا اور اس کے رسول کے سوا کسی اور کی سینکشن پر مبنی ہو۔ غیر مسلم جج نہ سہی، مسلمان جج بھی اگر مقرر کر دیا جائے تو وہ بھی ایسے قانون کی رو سے مسلمان عورت کا نکاح فسخ نہیں کرسکتا۔ مسلمان عورت خدا کے قانون کی رو سے مسلمان مرد کے لیے حلال ہوتی ہے۔ غیر اللہ کا قانون اس کو اُس مرد کے لیے حرام اور دوسرے مرد کے لیے کس طرح حلال کرسکتا ہے؟ آپ پر جو مشکلات اور مصیبتیں نازل ہو رہی ہیں وہ غیر اسلامی نظام کی اطاعت قبول کرنے کی قدرتی پاداش ہیں۔ اس سزا سے بچنے کے لیے اگر آپ غیر شارع کو شارع کا منصب دیں گے تو یہ اُسی قسم کی حرکت ہوگی جیسے کوئی شخص ٹپکے کی مصیبت سے بچنے کے لیے چھت ہی گرا دے۔ ایک گناہ کی سزا سے بچنے کے لیے دوسرا گناہ اور عظیم ترین گناہ کرنا بچاؤ کی صورت نہیں ہے بلکہ اور زیادہ بربادی کی صورت ہے۔ بچاؤ کے سارے راستے بند ہیں۔ صرف ایک راستہ کھلا ہے اور وہ یہ ہے کہ غیر اسلامی نظام کو مٹا کر اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے جنگ کیجیے، اس کے لیے جیل جائیے، اس کے لیے لاٹھیاں کھائیے اس کے لیے سر تک دے دیجیے۔ تمام قربانیوں کا مستحق یہی ایک مقصد ہے اور باقی سب چھوٹے مقاصد ہیں۔

خدا اور اس کے رسول کے احکام سے بغاوت کی وبا مسلمانوں کی جماعت میں جس حد تک پہنچ چکی ہے اس کا اندازہ ایک واقعہ سے کیجیے جو ابھی پچھلے ہی مہینہ میں پیش آیا ہے۔ اگرچہ جسم قومی کے ان ناصوروں کو بار بار دکھانا نہ میرے لیے خوشگوار ہے، نہ ان کو دیکھنا برادرانِ دینی ہی کے لیے خوشگوار

ہوسکتا ہے، مگر کیا کیجیے کہ یہ ناسور ہیں موجود، اور روز افزوں شدت کے ساتھ رس رہے ہیں، اس لیے آنکھیں بند کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ انھیں دکھانا اور بار بار دکھانا چاہتا ہوں کہ پورے جسم کے سڑنے سے پہلے مسلمان ان کی طرف متوجہ ہوں۔

ریاست کپورتھلہ میں سلطان پور لودی ایک پرانا تاریخی مقام ہے جہاں ہمارے رفیق مستری محمد صدیق صاحب کچھ عرصہ سے مسلمانوں کو اقامتِ صلوٰۃ کی تلقین کر رہے ہیں۔ اس تلقین و تبلیغ کے مقابلہ میں سب سے زیادہ جس خاندان نے انحراف و استکبار کیا وہ مقامی ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب اور ان کا خاندان تھا۔ مستری صاحب نے سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی، مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر کار انھوں نے باہر کے لوگوں سے مدد مانگی۔ چنانچہ مولانا حبیب الرحمٰن لودھیانوی اور یہ عاجز، دونوں سلطان پور پہنچے اور ہم نے انتہائی نرم طریقہ سے افہام و تفہیم کی، لَعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى۔ مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد جو اطلاعات مجھ تک پہنچیں وہ یہ ہیں کہ مستری صاحب نے حکم الٰہی کی تبلیغ برابر جاری رکھی، اور اس پر ان لوگوں کا استکبار یہاں تک بڑھ گیا کہ مار پیٹ پر اتر آئے۔ اِدھر سے نہایت عاجزی و مسکنت کے ساتھ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ کا حکم سنایا گیا اور اُدھر سے جواب میں ڈنڈے برسائے گئے۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ کیا اس حد کو پہنچ کر بھی کوئی شخص مسلمان رہ سکتا ہے؟ اوّل تو عادۃً ترک نماز خود ایک ایسا فعل ہے جس پر ایمان کے مسلوب ہوجانے کا ظن غالب ہوتا ہے۔ تاہم زمانہ کے بگڑے ہوئے حالات کی رعایت سے اس بارے میں حکم کو کچھ نرم کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جب فرض یاد دلایا جائے اور اس کا جواب صریح انکار سے دیا جائے، اور جب انکار پر اتنا اصرار ہو کہ فرمان الٰہی سنانے والے کو مارا جائے تو بتائیے کہ ایسے دل میں ایمان کا شائبہ بھی ہوسکتا ہے؟ ایسے لوگ بھی مسلمان ہوں تو آخر نامسلمان کون ہوں گے؟

مگر واقعہ یہ ہے کہ ہماری قوم میں ایسے ایک دو نہیں بکثرت لوگ شامل ہیں۔ کریدے نہیں گئے اس لیے ان کا حال چھپا ہوا ہے، اور محض گناہ گار مسلمان ہی سمجھ کر چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ اگر کریدے جائیں تو صاف

کھل جائے کہ شدید قسم کے منافق ہیں جو مسلمان کی حیثیت سے ہماری قوم میں شامل ہیں۔ مسلمانوں کی معاشرت میں گھسے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں میں شادی بیاہ کر رہے ہیں۔ مسلمان بچوں کے معلم ہیں۔ قومی ادارات کے کرتا دھرتا ہیں۔ سیاسی مجالس میں قوم کے نمائندے ہیں۔ غرض ہر جگہ مسلمان کے طور پر لیے جا رہے ہیں۔ یہ نو کروڑ کا عظیم الشان جسم جو آپ کو نظر آ رہا ہے اس کا پھیلاؤ بڑی حد تک اسی آماس، اسی سوجن کا رہین منت ہے۔ اسی لیے جتنا اس جسم کا پھیلاؤ ہے اتنا اس میں زور نہیں ہے۔ سوجے ہوئے جسم کا مٹاپا قوت کا نہیں، الٹا ضعف کا سبب ہوتا ہے۔ مردم شماری کا یہ عدد کثیر دراصل ان منافقین کی تعداد کثیر ہی سے بنا ہے، اور اسی نے ہم کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ ہم اس تعداد کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اللہ اکبر! ہم ہندوستان میں نو کروڑ ہیں۔ بھلا اتنی بڑی قوم بھی کہیں "بے بس اقلیت" (HOPELESS MINORITY) ہو سکتی ہے۔ مگر سوچنے کا مقام ہے کہ "مسلمان" اور وہ بھی نو کروڑ کسی ایک ملک میں موجود ہوں، اور پھر ان کے دبدبے سے وہ ملک لرز نہ اٹھے، ان کے وزن سے اس ملک کا ہر ذرہ دب نہ جائے، یہ کہیں ممکن ہے؟ کہیں یہ بات تصور میں بھی آ سکتی ہے کہ "مسلمان" اتنی بڑی تعداد میں ہو کر بھی غلام ہوں، بے وزن اور بے اثر ہوں؟ یہ دراصل ممکن ہی اس وجہ سے ہوا کہ اس مردم شماری میں اکثریت منافقوں کی ہے۔ خدا کے قانون سے بغاوت کرنے والے اس میں بھرے ہوئے ہیں۔ اس میں ان لوگوں کی کثرت ہے جن کو خدا کی اور اس کے قانون کی ذرہ برابر پروا نہیں۔ یہ بھاری بھرکم تعداد ایسے بہت لوگوں پر مشتمل ہے جو ہمارا جہ کپورتھلہ کے تو چپراسیوں تک کا حکم ماننے سے انکار نہیں کر سکتے اس لیے کہ وہاں سے روٹی بھی ملتی ہے اور جوتی بھی مل سکتی ہے، مگر خدا کے بڑے سے بڑے حکم کو بھی ٹھکرا سکتے ہیں اس لیے کہ نہ وہ انھیں روٹی دیتا نظر آتا ہے، اور نہ انھیں اس سے کسی سزا کا خوف ہے۔ اس قسم کے منافقین کی کثرت ہی نے ہمیں اس قدر کمزور کیا ہے۔ اگر یہ سب کے سب ہماری جماعت سے نکل جائیں اور حقیقی مسلمان نو کروڑ نہیں ۹ لاکھ بلکہ اس سے بھی کم رہ جائیں تو خدا کی قسم ہمارا وزن موجودہ حالت سے بدرجہا زیادہ ہو گا اور ہم اب سے بہت زیادہ زور آور ہوں گے۔

مسلمانوں کو در حقیقت متبعین اسلام کی تعداد بڑھانے کی جس قدر ضرورت ہے اس سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ منافقین کی اس بھرتی سے اپنی جماعت کو صاف کر دیں۔ ان کا نکلنا رحمت ہے اور ان کا شامل رہنا لعنت ہے۔ جن کی گردن خدا کے سامنے اکڑتی اور بندوں کے سامنے جھکتی ہے ان کی ہمیں قطعاً ضرورت نہیں۔ ہم کو صرف ان کی ضرورت ہے جو خدا کے سامنے جھکنے والے اور سب کے سامنے اکڑنے والے ہوں۔ آنکھیں یہ دیکھتے دیکھتے تھک گئی ہیں کہ جو لوگ قانون الٰہی سے کھلم کھلا باغی ہیں وہ نہ صرف مسلمانوں میں شامل ہیں بلکہ اسلام کے نام سے فائدہ اٹھانے میں سب سے پیش پیش ہیں۔ مسلم قوم کے نام پر حقوق لینے ہوں، روٹیاں حاصل کرنی ہوں، اعزاز اور مناصب اور کرسیاں طلب کرنی ہوں تو یہ درجۂ اول کے مسلمان لیکن اسلامی عقائد اور اسلامی احکام کی پابندی کے لحاظ سے دیکھئے تو کسی درجے کے مسلمان بھی نہیں، بلکہ اسلام سے، اُس کے عقائد سے، اس کے احکام سے، اس کے شعائر سے غرض ہر چیز سے منحرف، اور صرف منحرف ہی نہیں بلکہ علی الاعلان باغی۔ اگر ان لوگوں میں کسی قسم کا اخلاقی احساس موجود ہوتا تو جس وقت یہ اپنے اندر یہ بات پاتے کہ اسلام کی اطاعت پر ان کا نفس آمادہ نہیں ہے، یا اسلام ان کے دل و دماغ میں نہیں اُترتا اُسی وقت اپنے غیر مسلم ہونے کا صاف اظہار کر دیتے اور مسلمانوں کی سوسائٹی سے الگ ہو جاتے۔ اس صورت میں ہم ان کو کم از کم انسانی احترام کا مستحق تو ضرور سمجھتے۔ لیکن جو طریقہ انھوں نے اختیار کر رکھا ہے وہ انہیں کسی عزت اور کسی احترام کا مستحق نہیں رکھتا اس لیے کہ منافق اور جاسوس کے لیے دنیا کے کسی قانون میں بھی کوئی حرمت نہیں۔ آزاد قوموں میں ایسے لوگوں کو پھانسی دی جاتی ہے۔ ہم آزاد نہیں تو کم از کم اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ ان کو اپنی جماعت سے نکال باہر کریں، چاہے یہ ہمارے بھائی بند اور عزیز و اقارب ہی کیوں نہ ہوں۔

اسلام باپ سے بیٹے کو ناطفہ میں نہیں ملتا کہ جو مسلمان کے گھر پیدا ہو وہ لامحالہ مسلمان ہی ہو۔ اسلام کوئی نسلی قومیت نہیں ہے کہ جس طرح انگریز بہرحال انگریز رہتا ہے خواہ اس کے عقائد اور اصول حیات کیسے ہی

ہوں، اسی طرح مسلمان بھی بہر حال مسلمان ہی رہے، خواہ وہ قرآن کی تعلیم اور اس کے احکام کا متبع ہو یا نہ ہو۔ جن لوگوں نے مسلمان کے معنی یہ سمجھے ہیں، اور اس بنا پر وہ اسلام سے باغی ہونے کے باوجود اپنے آپ کو نہ صرف مسلمان کہتے اور سمجھتے ہیں بلکہ مسلم قومیت کے علمبردار اور حقوق مسلمین کے وکیل بھی بنتے ہیں ہیں ان سے صاف کہتا ہوں کہ وہ سخت غلطی پر ہیں۔ اسلام محض ایک عقیدہ، ایک مسلک اور ایک نظامِ زندگی ہے۔ جو اس کی صحت وصداقت پر ایمان لاکر اس کا اتباع کرتا ہے وہی مسلمان ہے، اور جو اعتقاداً و عملاً اس کا متبع نہیں وہ مسلمان بھی نہیں۔ اس کا باپ اگر اس مسلک کا پیرو تھا تو ضرور وہ مسلمان تھا لیکن اگر وہ خود اس کا پیرو نہیں ہے تو وہ مسلمان نہیں ہے اور مسلمانوں کی جماعت میں اس کا شامل رہنا سراسر ایک جعل ہے۔ مارکس یا لینن کی اولاد اگر سوشلزم کی معتقد نہ ہو تو آپ انہیں محض اس بنا پر سوشلسٹ نہیں کہہ سکتے کہ ان کا باپ سوشلسٹ تھا۔ میسولینی کا بیٹا اگر فاشزم کا معتقد نہ ہو تو آپ اسے فاشسٹ نہیں کہہ سکتے، کیونکہ میسولینی کا خون چاہے اس کو نطفہ میں ملا ہو مگر فاشزم تو نہیں ملا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اسلام بھی جب اسی طرح ایک نسلی چیز نہیں بلکہ شعوری اور مسلکی چیز ہے، تو ان لوگوں کو مسلمان کہا جائے جو مسلمان ماں باپ کی اولاد ضرور ہیں مگر نہ اپنے شعور کے اعتبار سے مسلمان ہیں اور نہ مسلک کے اعتبار سے۔ اسی بنا پر تو قرآن نے حضرت نوح کے بیٹے پر اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ کا حکم لگایا ہے۔

اگر کسی دوکان پر آپ "ولایتی سودیشی بھنڈار" کا بورڈ لگا دیکھیں، یا کسی سوسائٹی کا نام "اشتراکی مہاجنوں کی جماعت" سنیں تو یقیناً آپ کو یہ چیز مضحکہ انگیز معلوم ہوگی، کیونکہ یہ صریح تناقضِ بیان (CONTRADICTION IN TERMS) ہے۔ لیکن آپ "اسلامی بنک" اور "اسلامی انشورنس کمپنی" جیسے نام سنتے ہیں اور آپ کو ہنسی نہیں آتی، اور نہ اس میں آپ کو کسی قسم کا تناقض محسوس ہوتا ہے۔ آخر اس بے شعوری کی وجہ کیا ہے؟ صرف یہ کہ اسلام کے متعلق آپ کا تصور بالکل غلط ہے۔ آپ مسلمان زادے کو لازماً مسلمان سمجھتے ہیں، اور پھر

یہ مسلمان جو کچھ بھی کرے وہ آپ کے نزدیک "اسلامی" ہوتا ہے، خواہ وہ اصول اسلام کی عین ضد ہی کیوں نہ ہو۔ کچھ بعید نہیں کہ اس بے شعوری کی بنا پر آپ رفتہ رفتہ اسلامی شراب خانہ، اسلامی قحبہ خانہ، اسلامی قمار خانہ، اسلامی رقص گاہ وغیرہ ناموں کو سننے اور قبول کرنے کے لیے بھی تیار ہو جائیں!

مسلمانوں کی زندگی میں ہر طرف یہی تناقض مجھے نظر آ رہا ہے۔ ایک صاحب کسی ہوٹل میں بیٹھ کر خدا اور رسول کا مذاق اڑا رہے ہیں اور اسلام پر پھبتیاں کس رہے ہیں، مگر پھر بھی مسلمان ہیں۔ دوسرے صاحب مارکس پر ایمان لائے ہوئے ہیں اور محمد رسول اللہ کی تعلیم کے متعلق خود کہتے ہیں کہ میرے دماغ میں نہیں سماتی۔ مگر یہ بھی مسلمان ہیں۔ تیسرے صاحب سود کھاتے ہیں اور زکوٰۃ کا نام تک نہیں جانتے مگر یہ بھی مسلمان ہیں۔ ایک اور بزرگ بیوی اور بیٹی کو میم صاحبہ یا شریمتی بنائے ہوئے سینما لیے جا رہے ہیں یا کسی رقص و سرود کی محفل میں صاحبزادی سے وایولین بجوا رہے ہیں اور آپ کے ساتھ بھی لفظ مسلمان بدستور چپکا ہوا ہے۔ ایک دوسرے ذات شریف کے لیے نماز روزہ، حج زکوٰۃ سب حرام اور شراب زنا سود اور ایسی ہی سب چیزیں حلال، اسلام اور اس کی تعلیمات کے متعلق ایک حرف نہیں جانتے، زندگی دیکھیے تو ان میں اور ایک ہندو یا عیسائی یا پارسی کی زندگی میں رتی برابر فرق نہیں، مگر ان کو بھی مسلمان ہی کہا جاتا ہے۔ اسی طریقہ سے آپ اپنی جماعت کا جائزہ لیں گے تو اس میں بھانت بھانت کا "مسلمان" آپ کو نظر آئے گا۔ مسلمان کی اتنی قسمیں ملیں گی کہ آپ اس کا شمار نہ کر سکیں گے۔ اسلام کے گھر کو ایک چڑیا گھر سمجھ لیا گیا ہے کہ جس میں چیل، کوّے، گدھ، بٹیر، تیتر اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں اور ان میں سے ہر ایک "چڑیا" ہے کیونکہ چڑیا گھر میں داخل ہے۔ خدا را کوئی بتائے کہ یہ آخر کیا مذاق ہے، اور کب تک جاری رہے گا؟ کیوں نہ ہم اس چڑیا گھر کو توڑ دیں تاکہ اس "چڑیائی" قومیت کا خاتمہ ہو جائے اور ہر چڑیا اپنی اپنی جنس سے جا ملے؟ یہ ناجنسوں کا اجتماع آخر کس معنی میں ہمارے لیے مفید ہے؟

ابھی ایک صاحب کا خط میرے پاس آیا ہے جس میں انھوں نے مسلمانوں کے ایک بڑے مشہور لیڈر کے ساتھ اپنی گفتگو کا خلاصہ بیان کیا ہے۔ یہ لیڈر صاحب ہمارے قومی حقوق کے علمبردار اکبر ہیں، اور اس حیثیت سے ان کو مسلم اکبر ہونا چاہیے تھا مگر خیالات یہ ہیں کہ سیاست اور مذہب کو الگ ہونا

چاہیے، اور دلیل میں سند لاتے ہیں کمال اتاترک کی سنت سے۔

میں نے مراسلہ نگار کو جواب دیا کہ اپنے ان لیڈر صاحب سے کہہ دیجیے کہ تم جاہل ہو اور تمھارے وہ ائمہ جن کی سنت کا تم اتباع کر رہے ہو، تم سے بڑے جاہل تھے۔ ہو سکتا ہے کہ تم کسی دوسری چیز کے عالم بلکہ ماہر ہو، مگر اسلام میں تمھاری حیثیت یقیناً ہی جاہل مطلق کی ہے۔ تم کہتے ہو کہ سیاست کا تعلق اسلام سے کاٹ دینا چاہیے۔ بہت اچھا۔ مان لیا کہ کاٹ دینا چاہیے، مگر بتاؤ کہ زندگی کی کس چیز کا تعلق تم اسلام سے قائم رکھنا چاہتے ہو؟ تمدن کا؟ معاشرت کا؟ معاشی معاملات کا؟ اخلاق و آداب کا؟ تعلیم کا؟ اجتماعی قوانین کا؟ ایک ایک چیز کے حق میں تمھارا یہی فیصلہ ہے کہ اسے بھی کاٹو، اور عملاً تم کاٹ چکے ہو۔ تھوڑی دیر کے لیے ہم مان لیتے ہیں کہ یہ سب چیزیں بھی اسلام سے الگ کر دی جائیں۔ اچھا اب ان چیزوں کے متعلق کہو جن کو تم کہتے ہو کہ یہ مذہب ہیں۔ عقائد؟ ان کے متعلق تم کہتے ہو کہ خیالات جدید (MODERN THOUGHT) معیار حق ہیں۔ جو باتیں ان کے مطابق ہیں وہ تو اسلام میں رہیں اور جو ان کے خلاف ہیں وہ نکالی جائیں یا بدلی جائیں۔ اور لطف یہ ہے کہ اگر تم سے پوچھا جائے کہ اسلام میں کیا کیا چیزیں خیالات جدید کے موافق ہیں، وہی بتا دیجیے؟ تو تم اس کا جواب بھی نہیں دے سکتے، حتیٰ کہ اسلام کے متعلق تم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے کہ اسلام وہی ہے جو کہ اسلام ہے! اس کے بعد احکام اور فرائض کا سوال سامنے آتا ہے۔ ان میں سے کس چیز کی پابندی کے لیے تم تیار ہو؟ نماز کی؟ روزہ کی؟ حج کی؟ زکوٰۃ کی؟ کسی چیز کی پابندی کے لیے بھی تم تیار نہیں۔ درحقیقت ان کو تم فرض ہی نہیں جانتے۔ اچھا نکاح؟ اس باب میں تمھارا فتوے یہ ہے کہ یہ کوئی مذہبی چیز نہیں، محض ایک تمدنی معاملہ ہے۔ مسلم اور غیر مسلم کے درمیان بھی ہو تو مضائقہ نہیں۔ اور ہاں داڑھی سے نکل کر بھی کچھ خوش طبعی کر لی جائے تو دقیانوسی خیالات کی پیروی نہ کرنی چاہیے کہ اس پر ناک بھوں چڑھائی جائے۔ اب ارشاد ہو کہ یہ سب چیزیں نکل جانے کے بعد اسلام ہے کیا چیز؟ اس میں رہ کیا جاتا ہے؟ فقط نام؟ یہ اسم بے مسمیٰ ہے جس کے علمبردار بن کر آپ اٹھے ہیں؟ اس نام کے لیے ہم دنیا بھر سے لڑائی مول لیں؟ اس کے لیے ہم ہر ایک قوم سے الگ اپنی جمعیت بنائیں؟ اس کے لیے تمھارے جلوس نکالیں اور تمھیں جھنڈے پر چڑھائیں؟ یہ تمھاری چیخ پکار اور یہ تمھاری بلند آہنگیاں اسی بے معنی شے کے لیے ہیں؟

یہ لوگ علم سے تو محروم ہیں ہی، مگر ان غریبوں کو معمولی عقل عام سے بھی کوئی بہرہ نہیں ملا۔ یہ سوشلسٹ سے نہیں کہہ سکتے کہ تو سوشلزم کو سیاست اور معیشت اور تمدن سے الگ کرے۔ یہ نازی اور فاشسٹ سے نہیں کہہ سکتے کہ تو نازیت اور فاشزم

کا تعلق تمدنی نظریات اور سیاسی اور معاشی معاملات سے کاٹ دے۔ اگر ان کے سامنے ایسی کوئی تجویز پیش کی جائے تو یہ خود اس پر قہقہہ لگائیں گے اور کہیں گے کہ تمہارا دماغ خراب ہوا ہے۔ یہ غیر معقول بات تمہارے ذہن میں آئی کیسے کہ سوشلسٹ کی سیاست یا اس کی معیشت سوشلزم سے الگ ہو جائے؟ ان چیزوں کی نفی خود سوشلزم کی نفی ہے، اور سوشلسٹ ان کی نفی قبول کر کے سوشلسٹ رہ کیسے سکتا ہے؟ وہ جب دوسرے کسی نظام کے اصول و نظریات اختیار کرے گا تو غیر سوشلسٹ ہو جائے گا ۔۔۔ آپ جب چاہیں اس قسم کی کوئی تجویز ان کے سامنے پیش کر کے دیکھ لیں۔ ان کی طرف سے جو جواب میں دے رہا ہوں، لفظ بلفظ یہی جواب خود ان کے منہ سے آپ سن لیں گے ۔۔۔ مگر یہ عقل کے دشمن جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، سوشلسٹ اور نازی اور فاشسٹ کی پوزیشن تو سمجھ لیتے ہیں، البتہ مسلمان کی پوزیشن نہیں سمجھ سکتے۔ ان کی عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ سیاست میں غیر مسلم، معیشت میں غیر مسلم، تمدن و معاشرت میں غیر مسلم، اخلاق اور قانون میں غیر مسلم، افکار اور نظریات میں غیر مسلم، عقائد اور اعمال میں غیر مسلم ہونے کے بعد آدمی مسلم کیسے ہو سکتا ہے؟ اسلام جن عناصر سے مرکب ہے وہ سب نکل جائیں اور پھر اسلام بدستور قائم کا قائم رہے؟ مسلم جن خیالات کے معتقد اور جن اصولوں کے پیرو کا نام ہے وہ سب اس سے سلب کر لیے جائیں اور پھر وہ مسلم بھی کہلائے۔ کیسی متناقض بات ہے؟ ان لوگوں کا دماغ خراب نہیں ہوا تو اور کیا ہوا ہے کہ مسلمان سے کہتے ہیں کہ تو غیر مسلم ہو جا اور پھر مسلمان بھی رہ؟

یہ ان لوگوں کا حال ہے جو مسلمانوں کی کشتی کے کھویا بنے ہوئے ہیں۔ سبحان اللہ! ایسا وقت آنا بھی ہماری قسمت میں لکھا تھا کہ گندے پانی کے نہنگ کشتی اسلام کے ملاح بنیں۔

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

عجیب فتنہ کا دور ہے۔ جو زبانیں اس لائق بھی نہیں کہ اسلام کا پاک نام لے سکیں وہ اس کی وکیل، اس کی نقیب اور اس کی حمایت کی ذمہ دار بنی ہیں۔ منافق افراد سے قوم بھری ہوئی ہے۔ رؤسائے منافقین پیشوایانِ قوم بنے ہوئے ہیں۔ اسلام کا علم رکھنے والے دعویٰ پوشوں پر "قومیت متحدہ" کا بھوت سوار ہے۔ ان کی غیرتِ ایمانی اتنی سرد ہو چکی ہے کہ کفار کو اپنا امام ماننے میں بھی تامل نہیں کرتی۔ اب خدا کے سوا کون ہے جس سے فریاد کی جائے۔ یا تو وہ ہمیں اپنی پاک دنیا سے اٹھا لے، یا پھر اتنی طاقت بخشے کہ ان سارے فتنوں کا سر کچل دیں۔

مقالات

جواہر حکمت

ازافادات علامہ حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ

{علامہ حافظ ابن عبدالبر کا نام کسی صاحب علم کے لئے تعارف کا محتاج نہیں، اور نہ آپ کا مقام علم واجتہاد کسی پر مخفی ہے۔ آپ کا شمار ائمہ سلف کی صفِ اول میں ہے۔ فقیہ اور مجتہد بھی ہیں اور حافظِ حدیث بھی۔ علامہ ابن تیمیہ اور ابن قیم جیسے اربابِ نظر ان کے خوشہ چینوں میں ہیں۔ وسعتِ نظر، عالمانہ تبحر اور تفقہ فی الدین کے مسلّم امام ہیں۔ اندلس کی خاک سے ایسا خادمِ شریعت شاید ہی کوئی اور اٹھا ہو۔ قرطبہ میں پیدا ہوئے۔ ۲۵ ربیع الآخر ۳۶۸ھ یوم پیدائش ہے۔ اپنے وطن ہی کے مشہور اہلِ علم سے استفادہ کیا۔ علم کے لئے اندلس سے باہر کبھی نہیں گئے لیکن احفظ اہل المغرب تسلیم کئے گئے ہیں۔ بعض وجوہ کی بنا پر جلاوطن بھی کئے گئے۔ کچھ دنوں مغربی حصوں میں رہے، پھر مشرقی اندلس میں چلے آئے۔ خلیفہ مظفر کے زمانہ میں اشبونہ کے قاضی رہے۔ ربیع الآخر ۴۶۳ھ میں وفات پائی۔ متعدد تصنیفیں چھوڑی ہیں جن میں سے ایک مشہور تالیف "جامع بیان العلم" ہے۔ اسی سے ہم بعض مفید حصّوں کا اقتباس درج کرتے ہیں۔}

تقلید اور اتباع کا فرق ابوعبداللہ بن خویز منداد البصری المالکی فرماتے ہیں:-

"شرع میں تقلید کا مفہوم یہ ہے کہ کسی ایسے قول کی پیروی کی جائے جس کی دلیل صحت پر مقلد کو اطلاع نہ ہو۔ یہ تقلید شریعت کی نگاہ میں ناجائز ہے۔ اور اتباع ایسے قول کی پیروی کو کہتے ہیں جو

دلیل و حجت سے ثابت ہو۔"

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں :۔

"اگر تم کسی شخص کے قول کی اقتدار دلائل کی قوت کے بجائے محض حسنِ ظن کی بنا پر کرتے ہو تو تم اس کے مقلد کہے جاؤ گے اور اللہ کے دین میں تقلید ممنوع ہے۔ اور اگر تم کو حجت و برہان کی طاقت نے کسی قول کی پیروی پر مجبور کر دیا ہے تو تم اس کے متبع کہلاؤ گے۔ اتباع، شریعتِ الٰہی میں جائز ہے بخلاف تقلید کے۔"

مقاصدِ تقلید | نقلی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے اپنی اتاری ہوئی کتاب میں جگہ جگہ تقلید کی مذمت کی ہے۔ عدی ابن حاتم رضی دربارِ رسالت میں ایک بار حاضر ہوئے۔ آنحضرت صلعم سورۂ براءت کی تلاوت فرما رہے تھے۔ جب آپ آیت "اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" پر پہنچے تو عدی ابن حاتم نے کہا کہ یا رسول اللہ ہم نے تو اپنے علماء و مشائخ کو کبھی نہیں پوجا۔ آپ نے فرمایا "کیوں نہیں۔ کیا وہ لوگ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو تمھارے لئے حلال نہیں کر دیا کرتے تھے اور تم بلا حیل و حجت انہیں حلال سمجھ لیتے تھے؟ اسی طرح کیا وہ خدا کی حلال ٹھیرائی ہوئی چیزوں کو حرام نہیں کر دیتے تھے اور تم بے چون و چرا انہیں حرام مان لیتے تھے؟" انھوں نے جواب دیا "ہاں یہ تو صحیح ہے۔" حضور نے فرمایا "تلك عبادتهم" "یہی ان کی عبادت ہے۔"

اسی اندھی تقلید کی داستان ایک مقام پر قرآن یوں بیان کرتا ہے :۔

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓي اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓي اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ۝ الخ	اور اسی طرح تم سے پہلے جس ڈرانے والے (نبی) کو بھی ہم نے کسی قریہ میں بھیجا اس قریہ کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے تو اپنے بڑوں کو ایک راستے پر پایا ہے اور ہم تو انہیں کے نقش قدم کی پیروی کریں گے۔

گویا محض تقلیدِ آباء نے انھیں ہدایت قبول کرنے سے روکا۔ اور آخر کار انھوں نے صاف صاف کہہ دیا

کہ ہم تمہاری تعلیم کو کبھی نہیں مان سکتے اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب بت پرستوں سے مذمت اور تحقیر کے انداز میں فرماتے ہیں کہ:-

مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ۔ یہ مورتیاں کیسی ہیں جن کے تم گرویدہ ہو رہے ہو؟

تو جواب میں وہ بس یہی دلیل دیتے ہیں کہ:-

وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے۔

اسی طرح بیشمار آیتوں میں اس آبا پرستی اور اکابر قوم کی کورانہ تقلید کی مذمت کی گئی ہے۔ اگرچہ ان آیتوں میں جن مقلدوں کی مذمت بیان کی گئی ہے وہ کفار میں سے ہیں اور امت اسلامیہ کے مقلدین اہل ایمان میں سے ہیں۔ یہ فرق ضرور ہے۔ لیکن اس کے باوجود علماء نے انہی آیتوں سے ابطالِ تقلید پر استدلال کیا ہے۔ ان کے نزدیک دونوں گروہوں میں وجہ مشابہت کفر و ایمان نہیں ہے، بلکہ یہ مشابہت دونوں تقلیدوں کی نوعیت کے لحاظ سے ہے۔ یعنی جس طرح پہلی قسم کے مقلدین کا گناہ یہ تھا کہ وہ دلیل و حجت کے بغیر اپنے پیشواؤں اور اپنے اسلاف کی تقلید کرتے تھے اسی طرح یہ دوسری قسم کے مقلدین بھی کسی طریقہ کی پیروی کے لئے خدا کی کتاب اور رسول کی ہدایت سے دلیل ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں سمجھتے بلکہ مجرد ایسے لوگوں کے قول کو سند اور حجت سمجھتے ہیں جن کے ساتھ انہیں حسن ظن ہے۔ یہ فرق ضرور ہے کہ ایک شخص تقلید کرتا ہے اور انجام کار کفر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ دوسرا تقلید کرتا ہے اور گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور تیسرا کسی معمولی دنیوی مسئلہ میں تقلید کر کے خطا میں پڑ جاتا ہے۔ اگرچہ ان کا انجام جدا جدا ہوا مگر اس لحاظ سے تو مساوی ہیں کہ ان کے مبتلائے غلط ہونے کی علت ایک ہے، یعنی غیر نبی پر اعتمادِ تام، اور کسی ایسے شخص کے پیچھے آنکھیں بند کر کے چلنا جس کے پاس خدا کی طرف سے براہِ راست علم نہیں آتا۔

رسول اللہ صلعم نے ایک بار فرمایا کہ میں اپنے بعد اپنی امت کے لئے اس کے تین اعمال سے اندیشناک

ہوں"۔ پوچھا گیا یا رسول اللہ وہ اعمال کون سے ہیں؟ آپ نے فرمایا "عالم دین کی لغزش، ظالم بادشاہ کی حکمرانی اور خواہش نفس کی پیروی"۔

ابوالعالیۃ الریاحی سے مروی ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا "عالم کی لغزشوں سے متبعین کے لئے بڑی خرابی ہے"۔ لوگوں نے کہا اس کی توضیح فرمائیے۔ جواب دیا:۔

"ایک عالم اپنی رائے سے ایک بات کہتا ہے، پھر کسی بڑے عالم بالسنۃ کو پاتا ہے اور اس سے شریعت کا صحیح حکم سُن کر اپنے قول سے رجوع کر لیتا ہے۔ مگر جو لوگ اس کی پیروی کرتے ہیں انہیں اسکے رجوع کی کیا خبر؟ وہ تو اسی پہلے قول کی پیروی کئے چلے جائیں گے جس سے وہ رجوع کر چکا ہے"۔

حکما نے عالم کی غلطی کو کشتی کے ٹوٹنے سے تشبیہ دی ہے، کیونکہ جب وہ ڈوبتی ہے تو اپنے ساتھ ایک کثیر جماعت کو بھی غرق کر دیتی ہے۔ یہی حال عالم کا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت معاذؓ بن جبل نے فرمایا کہ لوگو! تم تین چیزوں کے ساتھ کیا کروگے؟ دنیا، جو تمہارے لئے سراپا ہلاکت ہے۔ عالم کی لغزش۔ اور منافق کا قرآن سے استدلال۔ یہ سوال سُن کر سب لوگ خاموش رہے۔ پھر حضرت معاذ نے خود ہی جواب دیا:۔

"پہلے عالم کو لو۔ عالم اگر ہدایت کی سیدھی شاہراہ پر ہے تو جوشِ عقیدت میں تمھیں نہ چاہئے کہ اپنا دین اس کے سپرد کر دو (یعنی اس کی اندھی تقلید کرنے لگو)۔ اور اگر وہ شاہراہِ ہدایت سے ہٹا ہوا ہے اور فتنوں کا شکار ہو گیا ہے تو اشتعال میں آ کر اس سے اپنے تعلقات بالکل منقطع نہ کر لو۔ کیونکہ مومن بھٹک کر تائب ہو جایا کرتا ہے.... الخ"

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ:۔

"دیکھو تم میں سے کوئی اپنے دین کی باگ کسی دوسرے انسان کے ہاتھ میں نہ دے کہ اگر وہ ایمان پر رہے تو تم بھی صاحبِ ایمان رہو اور اگر وہ گمراہ ہو گیا تو تم بھی اسی کے ساتھ گمراہ ہو جاؤ۔

شرع میں آنکھیں بند کرکے چلنے کا کام نہیں ہے"۔

محمد بن حارث سے روایت ہے کہ مالک بن انس اور عبدالعزیز ابن ابی سلمہ اور محمد بن ابراہیم بن دینار وغیرہ ابن ہرمز کے پاس جایا کرتے تھے۔ جب مالک بن انس اور عبدالعزیز ان سے کسی مسئلہ کے متعلق استفسار کرتے تو وہ جواب دے دیتے لیکن جب کبھی ابن دینار وغیرہ کوئی سوال کرتے تو وہ خاموش رہتے۔ ایک دن ابن دینار نے ان سے کسی قدر ملول اور کبیدہ خاطر ہوکر پوچھا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ ابن ہرمز نے جواب دیا کہ تمھیں میری اس روش سے برا نہ ماننا چاہئے۔ بات یہ ہے کہ میں بوڑھا ہوگیا ہوں۔ میری ہڈیاں کمزور اور اعضا مضمحل ہوگئے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں میرے بدن کی طرح میری عقل و فہم بھی ضعیف اور مضمحل نہ ہوگئی ہو اور میں صحیح و حق جواب نہ دے سکوں۔ مالک اور عبدالعزیز عالمانہ نگاہ اور فقیہانہ بصیرت رکھتے ہیں۔ جب مجھ سے کوئی خلافِ حق بات سنیں گے تو اپنے علم و فہم کی کسوٹی پر پرکھ کر رد کر دیں گے لیکن تم لوگوں کا حال بالکل دوسرا ہے۔ میں جو کچھ بھی کہوں گا، خواہ غلط ہو یا صحیح، سب قبول کر لوگے"۔ محمد بن حارث یہ روایت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم یہی دین کامل اور عقل راجح کی شان ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے:۔

"ایک وقت آئے گا جب علما ختم ہو جائیں گے اور لوگ کم سواد بڑوں سے مسائل شرعیہ میں رجوع کریں گے۔ وہ بغیر کسی علم و آگہی کے فتوے دیں گے، خود گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے"۔

سفیان ابن عُیینہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ربیعہ لیٹے ہوئے مُنہ ڈھانک کر رو رہے تھے۔ لوگوں نے پوچھا کیا بات ہے؟ فرمایا کھلی ہوئی ریاکاری اور خفیہ نفس پرستی کا عام طوفان آیا ہوا ہے اور لوگ علماء کے ہاتھوں میں اس طرح پڑے ہیں جیسے شیرخوار بچے اپنی ماؤں کی آغوش میں کہ جس چیز سے علماء روکتے ہیں یہ اس سے رک جاتے ہیں اور جس چیز کا وہ حکم دیتے ہیں یہ بلاچون و چرا اسی کو کرنے لگتے ہیں۔

ایوب رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ:۔

"تم اپنے شیخ کی غلطی پر اس وقت تک مطلع نہیں ہو سکتے جب تک دوسرے علماء کی صحبت نہ اختیار کرو۔"

عبید اللہ ابن معتمر فرماتے ہیں کہ:-

"مقلد انسان اور اس جانور میں کوئی فرق نہیں جس کی گردن کی رسی کسی اور کے ہاتھ میں ہو۔"

یہ تمام نصوص اور اقوال تقلید محض کے بطلان پر شاہد ہیں، لیکن اس شہادت کے سننے اور سمجھنے کے لئے عقل و فہم کی ربانی توفیق درکار ہے۔

ابطالِ تقلید نظری حیثیت سے وجوب یا جواز تقلید کے قائل سے سوال یہ ہے کہ اس نے کس دلیل کی بنا پر اسے جائز یا واجب قرار دیا، اور کیونکر تمام سلف کے خلاف راہ اختیار کی؟ اس لئے کہ سلف صالح میں تو کسی سے بھی تقلید ثابت نہیں۔ اس سوال کے جواب میں اگر وہ یہ کہے کہ میں کتاب و سنت سے واقف نہیں ہوں اور میرا امام ان سے واقف ہے لہٰذا میں اس کی تقلید کر رہا ہوں تو اس سے کہا جائے گا کہ جو مسائل شرعیہ تمام ائمۂ مجتہدین کے درمیان متفق علیہ ہیں، وہ یقیناً حق ہیں اور ان کے بارے میں تم تقلید کر سکتے ہو لیکن جن مسائل میں اختلاف ہے، جن میں ایک امام کی رائے کچھ ہے اور دوسرے کی کچھ، ان میں تم کس دلیل کی بنا پر ایک شخص معین کی تقلید کرو گے اور دوسرے کو چھوڑ دو گے درانحالیکہ یہ سب کے سب امام، عالم اور مجتہد ہیں؟ بہت ممکن ہے کہ وہ مجتہد جس کی رائے کو تم ناقابلِ التفات سمجھ رہے ہو تمہارے امام سے زیادہ صحیح مسلک رکھتا ہو۔ اگر وہ یہ جواب دیتا ہے کہ میں اسے حق و صواب پر سمجھ کر تقلید کر رہا ہوں، تو اس سے پوچھا جائے گا کہ کیا اس کے قول کی صحت کا علم تمہیں کتاب و سنت یا اجماع سے ہوا ہے؟ اگر اس نے اثبات میں جواب دیا تو خود اس نے تقلید کا ابطال کر دیا۔ پھر اس صورت میں اس سے ان دلائل کا مطالبہ کیا جائے گا جن کا اس نے ابھی ادعا کیا ہے۔ اور اگر وہ پھر وہی جواب دے کہ چونکہ وہ مجھ سے بڑا عالم ہے اس لئے میں نے اس کی پیروی کی، تو اس سے

کہا جائے گا کہ اگر یہی تقلید کا سبب ہے تو ہر اس شخص کی تقلید کرو جو تم سے بڑا عالم ہو۔ اس وقت تمھارے بے شمار امام ہو جائیں گے جن کی پیروی مذکورہ بالا اصول یا علت کی بنا پر تمھارے لئے ضروری ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ تمام علماء بھی ہمیشہ متفق الرائے نہیں رہ سکتے۔ ان میں اکثر اختلاف رائے ہوتا رہے گا۔ پھر تم ان میں سے کس کے قول کی تقلید کروگے اور کیوں؟ اب اگر وہ کہے کہ میں ان میں سے ایک کا اتباع اس وجہ سے کروں گا کہ وہ تمام میں سربرآوردہ اور اعلم الناس ہوگا، تو اس سے کہا جائے گا کہ گویا وہ صحابہؓ سے بھی بڑھ کر صاحبِ علم ہے! اور یہ کس قدر مذموم خیال ہے۔ ہاں اگر وہ یہ کہہ کر دامن چھڑانا چاہے کہ میں تو صحابہؓ کرام میں سے ایک کی تقلید کرتا ہوں تو پھر سوال ہوگا کہ دیگر صحابہؓ کے اقوال کو ترک کرنے کی وجہ اور دلیل تمھارے پاس کیا ہے؟ ممکن ہے دوسرے صحابہؓ زیادہ علم و معرفت اور عظمت و فضیلت کے مالک ہوں۔ علاوہ ازیں کسی قول کی صحت و سقم کا دار و مدار تو تمام تر دلائل پر ہے۔ قائل کی شخصیت اور شانِ فضیلت پر نہیں ہے۔ چنانچہ امام مالک فرماتے ہیں کہ آدمی کا ہر قول خواہ وہ کیسا ہی صاحب علم و فضل ہو، اتباع کے لئے نہیں ہے۔ قرآنِ حکیم مومن کی تعریف یہ کرتا ہے کہ وہ اقوال سن کر ان میں سے محض احسن قول کی پیروی کرتے ہیں اَلَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ۔

اب اگر وہ اپنے قصورِ علم اور عدم بصیرت کا عذر کرے تو اس سے کہا جائے گا کہ ہاں ایسی صورت میں تم بلاشبہ کسی عالم کی تقلید کرنے میں نہ صرف معذور ہو بلکہ تم پر اس وقت تقلید کا التزام ضروری ہے، کیونکہ تمھاری مثال بالکل اندھے کی سی ہے جو خود قبلہ کی سمت نہیں معلوم کرسکتا اور اس کے لئے ضروری ہے کہ کسی قابلِ اعتماد آدمی کی رہنمائی قبول کرے اور جس طرف وہ کہے اسی سمت منہ کرکے نماز پڑھ لے لیکن ایسے مقلد کے لئے یہ کیسے جائز ہوگیا کہ وہ عالم دین ہونے کا دعویٰ کرے اور دوسروں کو بھی انھیں اقوال کے مطابق فتویٰ دیتا پھرے؟ درانحالیکہ ان کی صحت و سقم کے متعلق خود اسے کوئی علم نہیں ہے اور وہ اپنی جہالت کا خود معترف اور کم از کم نظریہ کی حد تک یہ بھی مانتا ہے کہ نبی کے سوا ہر شخص خواہ وہ کیسا ہی فاضل اجل ہو کبھی کبھی غلطیاں بھی کرتا ہے۔

دلیل معلوم کئے بغیر فتویٰ دینا جائز نہیں

جب یہ بات طے شدہ ہے کہ عالم غلطی بھی کرتا ہے تو کسی کے لئے جائز نہیں

کہ کسی شخص کے قول کی دلیل کتاب و سنت سے معلوم کئے بغیر اس کے مطابق فتویٰ دے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ ایک خطبے کے دوران میں فرماتے ہیں کہ "افسوس ہے ان حاملینِ علم پر جن کا علم کسی بصیرت پر مبنی نہیں، جن کے قلوب کو تشکوک کا ہلکا سا جھونکا مضطرب کر دیتا ہے، جو نہیں جانتے کہ حق کہاں ہے؟ اگر غلطی کرتے ہیں تو نہیں جانتے کہ غلط کہہ رہے ہیں۔ ایسی چیز کو اپنے سینے سے چمٹائے ہوئے ہیں جس کی حقیقت سے بالکل واقف نہیں۔ یہ ایک فتنہ کی کیفیت ہے۔ سب سے بڑا خیر یہ ہے کہ خدا دین کی معرفت و بصیرت عطا کرے۔ کسی شخص کے جہل کے ثبوت کے لئے یہ کافی ہے کہ اسے اپنے دین کا علم نہ ہو۔"

حضرت سعید ابن جبیر رضؓ حضرت ابن عباس رضؓ سے روایت کرتے ہیں کہ:۔

"اگر کوئی شخص اندھا بن کر بغیر کسی حجت اور بصیرت کے فتویٰ دیتا ہے تو اس فتویٰ پر عمل کرنے والے کا گناہ مفتی کی گردن پر ہوگا۔"

حضرت ابوہریرہ رضؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ:۔

جس شخص نے میرے متعلق ایسی بات کہی جو میں نے نہیں کہی تھی، اسے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنانا چاہئے۔ اور اگر کسی نے اپنے ساتھی سے مشورہ طلب کیا اور اس نے بغیر سوچے سمجھے مشورہ دے دیا تو اس نے اس کے ساتھ خیانت کی۔ اور اگر کسی مفتی نے اطمینان بخش ثبوت حاصل کئے بغیر فتویٰ دیا تو اس کا گناہ عامل کے بجائے مفتی کے سر پر ہوگا۔"

تقلید صرف عوام کے لئے ہے لیکن ان تمام تصریحات سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ حکم عام ہے، اور ہر عالم و جاہل اسی کے ذیل میں آتا ہے۔ یہ حکم محض علماء اور خواص کے لئے ہے۔ عوام کے لئے نہیں، کیونکہ عوام کے لئے واقعات اور معاملات پیش آنے پر علماء کی تقلید کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ ان کے لئے تقلید ضروری ہے اس لئے کہ وہ اپنے قصورِ فہم کی وجہ سے دلائل کی معرفت حاصل ہی نہیں کر سکتے۔ بایں سبب اس امر میں تمام علماء کا اجماع ہے کہ عوام پر تقلید فرض ہے۔ اور ارشادِ خداوندی فَاسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

کا روئے سخن انہیں عوام کی طرف ہے جس طرح اس بات میں کسی صاحب علم کو اختلاف نہیں ہے کہ اندھے کو قبلہ معلوم کرنے میں کسی غیر آدمی کی جس کی آگاہی اور قوت تمیز پر اسے اعتبار ہو، تقلید ضروری ہے، اسی طرح اس امر میں بھی دو رائیں نہیں ہیں کہ ایسے شخص کے لئے جو شریعت کے احکام و اسرار سے قطعاً نابلد ہے، ضروری ہے کہ کسی امام کی تقلید کرے اور یہی وجہ ہے کہ عوام کو فتوی دینے کا حق کسی نے نہیں دیا ہے کیونکہ وہ اسرارِ دین اور مصالح شرعیہ سے بالکل بے بہرہ ہوتے ہیں۔ البتہ غلطی پر وہ لوگ ہیں جو علمِ دین حاصل کرنے کے بعد بھی تقلید کے چکر میں پھنسے رہتے ہیں۔ علم دین حاصل کرنے کی غرض تحقیق حق ہے نہ کہ محض اگلوں کے اقوال سے واقف ہو جانا۔ جب ایک شخص اس ذریعہ کو حاصل کر لیتا ہے جس سے حق معلوم کیا جا سکتا ہے، اور پھر بھی وہ اس سے کام لے کر حق کی جستجو نہیں کرتا، اور یہ سمجھتا ہے کہ جستجوئے حق اس کا کام ہی نہیں ہے، تو اس کی غلط کاری و غلط فہمی ظاہر و باہر ہے۔

ترجمانُ القرآن ــ جیسا کہ علامہ نے مضمون کے آخر میں بصراحت فرما دیا ہے، تقلید کی مخالفت سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ لوگ علم کے بغیر اجتہاد کرنے لگیں۔ بلکہ مقصد دراصل یہ ہے کہ اول تو ہر مسلمان کو کم از کم اپنے دین سے اس حد تک ضرور واقف ہونا چاہیے کہ وہ ہدایت اور گمراہی میں تمیز کر سکے اور بالکل آنکھیں بند کر کے اپنا دین دوسروں کے ہاتھ میں نہ سونپ دے۔ دوسرے یہ کہ جو لوگ دینی علوم کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان کے لیے عقلاً و نقلاً کسی طرح بھی یہ درست نہیں ہے کہ اپنے اوپر تقلید کو لازم کر لیں۔ یہ دراصل ہمارے نظام تعلیم کا بنیادی نقص ہے کہ اس میں طالب علم کو تحقیق کے بجائے تقلید کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ وہ اس نظام میں داخل ہی اس تصور کے ساتھ ہوتا ہے کہ تمام مسائل کا قطعی تصفیہ پہلے ہو چکا ہے، اب تحقیق کے لیے کوئی چیز باقی نہیں رہی، اور اس کا کام فقط یہ ہے کہ اپنے ائمہ کے اقوال سے واقف ہو جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تحقیق کے ذرائع فراہم ہو جانے پر بھی وہ مقلد ہی رہتا ہے۔ تحقیق و اجتہاد کا رجحان ابتدا ہی میں فنا کر دیا جاتا ہے اور اس میں آخر وقت تک یہ صلاحیت پیدا نہیں ہوتی کہ خود کسی مسئلے میں رائے قائم کر سکے۔ ایسے نظام تعلیم سے کس خیر کی توقع کی جا سکتی ہے؟ قرآن و حدیث کو سمجھنے کے وسائل تو فراہم کر دیے جاتے ہیں مگر دل میں یہ بات بٹھا دی جاتی ہے کہ ان سے تمہیں کام کچھ نہیں لینا ہے۔ اس سے بڑھ کر ناقص تعلیم اور کیا ہو سکتی ہے۔

دلائل السنن والآثار

۲

از جناب مولوی نجم الدین صاحب اصلاحی

ضرورت سلسلۂ اسناد یہ ایک واضح ثبوت ہے اس امر کا کہ احادیث نبوی کے ساتھ اصولی احتیاط خلفائے راشدین کے وقت سے شروع ہوتی ہے۔ تابعین کے دور میں جب رفض، خروج، ارجاء، قدر، اعتزال کے قصے پیدا ہوجاتے ہیں تو بنا بر آیت اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ الخ اور زیادہ تشدد بڑھ جاتا ہے اور اسناد ایک مستقل فن قرار پاجاتا ہے جس کی بیسیوں شاخیں ہیں، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ ایک لطیف اشارہ

اہمیت اسناد پر قرآن حکیم میں ہے اِئْتُوْنِیْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَاۤ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ منکرین معاد و قرآن کے رد میں اوپر سے یہ سلسلہ چلا آتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے آسمان و زمین اور کل مخلوقات بنائی۔ کیا سچے دل سے کہا جاسکتا ہے کہ زمین کا کوئی ٹکڑا یا آسمان کا کوئی حصہ کسی اور نے بھی بنایا ہے یا بنا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں پھر خدا کے ساتھ معبودان باطل کو کیوں پکارا جاتا ہے؟ لہذا اگر تم اپنے دعوائے شرک میں سچے ہو تو کسی آسمانی کتاب کی سند لاؤ یا کسی ایسے علمی اصول سے ثابت کرو جو عقلا کے نزدیک مسلم چلا آتا ہو۔ جس چیز پر کوئی نقلی یا عقلی دلیل نہ ہو آخر اسے کیوں تسلیم کیا جائے؟ ظاہر ہے کہ کسی علمی دعوی کے لئے دلیل و سند ہی اصل شے ہے۔ دیکھو قرآن کی صداقت پر جہاں اور بہت سی دلیلیں موجود ہیں ان میں سب سے زبردست سند اس کا تاریخی ثبوت ہے جتنی مذہبی کتابیں دنیا کی مختلف قوموں کے پاس ہیں ان میں سے ایک کے متعلق بھی تاریخی سند سے یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ وہ جس نبی کی طرف منسوب ہے واقعی اسی نبی کی ہے۔ بلکہ بعض مذہبی

کتابیں ایسی ہیں جن کے متعلق سرے سے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کس زمانے میں کس نبی پر اتری تھیں۔ مگر قرآن کے متعلق اتنی زبردست تاریخی شہادتیں موجود ہیں کہ کوئی شخص حضرت محمد صلعم کی طرف اس کی نسبت میں تشکک ہی نہیں سکتا۔ اس کی آیتوں تک کے متعلق یہ معلوم ہے کہ کونسی آیت کب اور کہاں نازل ہوئی، جس کے روایت کرنے والوں کی اتنی زیادہ تعداد ہر زمانہ میں رہی ہے کہ جن کی صداقت و قطعیت پر ذرہ برابر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک ایک آیت اور اس کے تلفظ کی کیفیت کو ابتدائے نزول سے آج تک اتنے بیان کرنے والے ہیں کہ جن کی تاریخی حیثیت آفتاب سے زیادہ روشن ہے۔ چنانچہ یہی تواتر عملی و قولی ایسا تاریخی ثبوت اور کھلی ہوئی سند ہے کہ جس سے بڑھ کر کسی علمی شے کی ثبوت اور قطعیت کی کوئی دلیل و سند نہیں ہو سکتی۔ پس آیتِ بالا پر غور کرنے سے صاف طور پر یہ اصول ہاتھ آتا ہے کہ جس کسی مذہبی دعوی کے لئے یا تو آسمانی کتاب کی سند ہو یا کسی علمی اصول سے ثابت ہو وہ قرآن کے نزدیک حجت و سند دینی ہے۔

یہ تو ہوئی نقلی دلیل۔ اور عقلی دلیل یہ ہے کہ جب کسی بات کی نسبت کسی کی طرف کی جاتی ہے تو سب سے پہلے یہ سوال عقلی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ اس پر کیا ثبوت ہے کہ یہ فلاں کا کلام ہے؟ آدمی کہتا ہے کہ میں نے خود سنا ہے یا دیکھا ہے یا فلاں نے مجھ سے بیان کیا ہے یا دیکھا ہے۔ اگر یہ سلسلہ اس آدمی تک متصل ہے تو بات صاف ہے۔ اب صرف بات کی معقولیت اور ناقل کی صداقت کی بحث باقی رہ جاتی ہے، جس پر مفصل بحث آگے آئے گی۔ بہرحال اسی اصول کے ماتحت آسمانی کتابیں سنن و آثار نبوی، لغت و اشعار، فقہ و اصول حتی کہ ائمہ کے مذاہب اور تصوف کے سلاسل سنداً روایت ہونا شروع ہوئے اور یہ سلسلہ اتنا زبردست اور محکم ثابت ہوا کہ جس کی معقولیت اور ناقابلِ انکار مقبولیت نے مخالفین کی زبانوں پر مہر سکوت لگا دی۔ غور کرو کہ پیغمبر نے ایک بات کہی یا کوئی کام کیا۔ اگر وہ بات اور فعل اس طریقہ پر روایت ہوا اور ذرہ برابر اس کے اندر تغیر و تبدل نہیں ہوا تو ظاہر ہے کہ حق و صداقت اور روحانیت کے اثر اور اس کے برکات ہیں۔ پھر کیا کسی کو کوئی شبہ ہو سکتا ہے؟ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ہر علم اپنے اندر ایک خاص کیفیت و اثر رکھتا ہے، جس کی مزاولت و ممارست سے آدمی نیک و بد اور بات کے صحیح و غلط کا فیصلہ کرتا ہے۔

فن حدیث میں سند ایسا علم ہے کہ صرف اسی کے ذریعہ ہر دینی کام کی نسبت پیغمبر صلعم تک صحیح طور پر معلوم کی جاسکتی ہے اور اس وجہ سے گویا آدمی کے اندر معنیٰ صحابیت کا شرف پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ معنیٰ صحابیت نام ہے اطلاع بر جزئیات احوال رسول و مشاہدہ اوضاع و کیفیات کا، خواہ وہ عبادات سے متعلق ہوں یا عادات سے، جو بغیر سند قابل اعتبار نہیں۔ سند کے عالی او ر نازل ہونے کے صدہا واقعات کتب رجال و طبقات میں موجود ہیں جو غیر معمولی احتیاط پر دلالت کرتے ہیں۔ صرف ایک واقعہ یہاں پر درج کر دیا جاتا ہے جس سے سند کے عالی و غیر عالی ہونے کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

جب حضرت امام علی رضا رضی اللہ عنہ نیشاپور تشریف لے گئے تو حافظ حدیث امام ابو زرعہؒ و امام ابو مسلم طوسیؒ نے خدمت میں حاضر ہو کر امام ممدوح کے آباؤ اجداد کرام کے سلسلہ سے روایت حدیث کی درخواست کی۔ حضرت ممدوح نے اپنے والد ماجد سے لے کر جناب رسول خدا صلعم تک مرفوعًا روایت کی "قال حدثنی ابی موسیٰ الکاظم عن ابیہ جعفر الصادق عن ابیہ محمد الباقر عن ابیہ علی زین العابدین عن ابیہ شہید کربلا عن ابیہ علی المرتضیٰ قال حدثنی حبیبی و قرۃ عینی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال حدثنی جبرئیل علیہ السلام قال حدثنی رب العزۃ سبحانہ وتعالیٰ کلمۃ لا الہ الا اللہ حصنی فمن قالہا دخل حصنی ومن دخل حصنی امن من عذابی"۔ جب شمار اہل محابر و دواوین کا کیا گیا تو ۲۰ ہزار اشخاص وہاں حاضر پائے گئے۔ چنانچہ اسی سند کے متعلق امام الجرح والتعدیل حضرت امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں "لو قری ھذا الاسناد علی مجنون لافاق من جنونہ" حتی کہ امام ابو القاسم قشیریؒ نے لکھا ہے "اتصل ھذا الحدیث بھذا السند ببعض امراء السامانیۃ فکتبہ بالذھب واوصی ان یدفن معہ فی قبرہ فرأی فی المنام بعد موتہ فقیل لہ ما فعل اللہ بک فقال غفر لی بتلفظی لا الہ الا اللہ وتصدیقی ان محمدا رسول اللہ، اوردہ المناوی فی شرحہ الکبیر علی الجامع الصغیر (تقصار جیود الاحرار)

چنانچہ اسی بنا پر امام ابن سیرینؒ جو فن حدیث کے رکن اعظم ہیں ان کو کہنا پڑا، ان ھذا العلم دین فانظروا عمن تاخذون دینکم۔ قال لم یکونوا یسألون عن الاسناد فلما وقعت الفتنة قالوا سموا لنا رجالکم۔ الاسناد من الدین۔ لولا الاسناد لقال من شاء ما قال۔ الاسناد سلاح المومن۔ امام زہری بڑے رتبہ کے آدمی ہیں ایک روز سفیان بن عیینہ سے ایک حدیث بیان کرنی چاہی۔ سفیان نے فرمایا کہ آپ مجھ سے بلا سند بیان کیجئے کیونکہ ان کو امام زہری پر کامل اعتماد تھا۔ امام زہری نے فرمایا کیا تو بلا زینہ چھت پر چڑھ سکتا ہے[۱]؟۔

اور یہ واقعہ تو موطا امام مالکؒ کے پڑھنے والے تک کو یاد ہوگا کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے جو تبع تابعی اور خلفاء بنی امیہ میں بڑے رتبہ کے بزرگ ہیں جن کا شمار خلفاء راشدین کے ساتھ ہوتا ہے، ایک روز نماز عصر میں دیر کردی۔ عروہ بن مسعود تابعی نے ٹوکا اور رسول اللہ صلعم کا جبرئیل کے ساتھ نماز پڑھنا اور جبرئیل کا ابتدائی و انتہائی اوقات نماز بتانا بیان کیا۔ خلیفۂ وقت کو سخت تعجب ہوا۔ استعجاباً پوچھا، اعلم ما تقول یا عروة۔ دیکھو کیا کہہ رہے ہو۔ عروہ نے فوراً اس طرح سند پڑھ کر خلیفہ کو ساکت کر دیا کہ "مغیرہ بن شعبہؓ نے کوفہ میں ایک روز نماز میں دیر کردی تو ابو مسعود انصاریؓ نے ٹوک دیا اور کہا کہ مغیرہ یہ کیا ہے؟ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ جبرئیل نے دو روز آکر آنحضرت صلعم کو نماز پڑھ کر نماز کی ابتدا و انتہا کو بیان کر دیا"۔ بہرکیف یہ شہادتیں اس امر کی دلیل ہیں کہ اسناد ہی ایک ایسی کسوٹی ہے کہ جس کے ذریعہ صحیح و غلط اور روایت و خبر کے پرکھنے اور جانچنے کا اصول ہاتھ آتا ہے، انھیں اسناد میں سے بعض کو محدثین و فقہاء نے سلسلۃ الذہب سے تعبیر کیا ہے۔ مثلاً حضرت امام اعظمؒ کا جو سلسلۃ الذہب بیان کیا جاتا ہے وہ یہ ہے، ابوحنیفہ عن حماد بن ابی سلیمان عن ابراہیم عن علقمہ عن عبداللہ بن مسعودؓ۔ اسی طرح حضرت امام بخاری کے کئی سلسلے ہیں مثلاً محمد بن اسمٰعیل عن محمد بن عبداللہ الانصاری عن حمید عن انس بن مالکؓ۔ یہی امام بخاری کے بعض شیوخ حضرت امام ابوحنیفہؒ و امام مالکؒ کے ہم طبقہ ہیں۔ اور ثلاثیات بخاری، بخاری شریف کی ایک اہم اور محیر العقول چیز ہے۔ امام مالکؒ

[۱] تدریب الراوی

کا سلسلۃ الذہب بقول امام بخاریؒ یہ ہے: مالک عن نافع عن عبداللہ بن عمر۔ اسی قسم کی سندوں کے متعلق محدثین یہ الفاظ بھی بولتے ہیں، فھم اشھر من نار علی علم۔ تفصیل کے لئے فنی اعتبار سے معرفۃ علوم الحدیث للحاکم از صفحہ ۵۲ تا صفحہ ۵۸ مطبوعہ مصر ملاحظہ ہو، ثبوت بالا مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر درج کردئے گئے ہیں ورنہ ایں رشتہ بانگشت نہ پیچی کہ دراز است۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ ہر فن میں فن والے کی رائے اور اس کی تحقیق و تشریح ہی حجت و سند ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ سنن و آثار نبوی کے معلوم کرنے کے لئے سند کو اصل الاصول نہ قرار دیا جائے درانحالیکہ کوئی اور ذریعہ اس کے مستحکم اور محتاط اذعان ویقین کا موجود نہ ہو۔ بلاریب عمل بھی ایک اہم، مستحکم اور محتاط ذریعہ ہے لیکن یہاں بھی یہ بحثیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ کس کا عمل؟ ایا فرق باطلہ کا یا اہل حق و ارباب نقل کا؟ کیونکہ بہت سے ایسے مسائل پیدا ہو گئے ہیں کہ جن کا ثبوت صدر اول میں نہ تھا اور نہ کتاب و سنت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ مگر جماعتی عصبیت جاہلیت کا یہ عالم ہے کہ اسے بھی کتاب و سنت ہی سے ثابت کیا جاتا ہے اور مزید ثبوت کے لئے سواد اعظم اور عملی تواتر کا نام لیا جاتا ہے کہ برابر اہل علم اس پر عمل کرتے آئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عمل بھی وہی صحیح اور حق ہوگا جس کا سلسلہ صحابہؓ اور آنحضرت صلعم تک ثابت ہو اور یہ چیز بھی بدون سند صحیح قابل پزیرائی نہیں ہو سکتی۔ لہذا یہ مختصر گذارش ایک منصف اور محقق کے لئے بس ہے، تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل۔

عدالت و ثقاہت صحابہؓ یہ ایک ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ قرآن حکیم خدا کا آخری پیغام ہے جو تمام عالم کی رہنمائی کے لئے نازل کیا گیا ہے۔ یہ مقدس اور برگزیدہ صحیفۂ یزدانی حضرات صحابہؓ ہی کے ذریعہ سارے عالم میں پہنچا اگر ان حضرات کی عدالت اور ثقاہت وغیرہ مشتبہ ہی تو پھر دین و مذہب کی ساری اساس و بنیاد معرض بحث میں آجاتی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم ہی نے سب سے پہلے صحابہ کے فضائل و اخلاق اور عدالت و ثقاہت کو مفصل بیان فرمایا ہے اور جو لوگ قرآن سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اس کی آیات پر کامل تدبر و تفکر کرنے کے عادی ہیں ان کے سامنے یہ حقیقت (کہ صحابہ عادل اور ثقہ تھے) آفتاب سے زیادہ واضح ہے۔ استیعاب لابن عبدالبرؒ وغیرہ میں مفصل گفتگو ہے

اس پر موجود ہیں۔ اس موقع پر میں شیخ الاسلام حافظ ابن حجرؒ کی ایک تقریر کا خلاصہ اصابہ سے نقل کر دینا ضروری سمجھتا ہوں جو لمبی چوڑی تحریر و تقریر سے بے نیاز کر دینے والا ہے اور جو تمام تر قرآن مجید سے ماخوذ ہے۔ فرماتے ہیں :۔

"حضرات اہل سنت اس پر متفق ہیں کہ صحابہ عدول ہیں۔ اس باب میں کوئی اختلاف نہیں ہے سوا مبتدعہ کی ایک مختصر سی ٹولی کے خطیب نے کفایہ میں نہایت نفیس بحث اس موضوع پر کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ صحابہ کی عدالت و ثقاہت تو خود خدا کی تعدیل کے بموجب ہم مانتے ہیں۔ مثلاً كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ اور وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا۔ اور لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ الخ۔ اور وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ۔ اور يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ۔ اور لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ۔ غرض بہت سی آیتوں میں یہ ذکر موجود ہے کہ صحابہ عادل اور ثقہ ہیں۔ ان سب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تعدیل کے بعد اب وہ کسی تعدیل کے محتاج نہیں ہیں۔ اور اگر خدا اور رسول کی طرف سے یہ کچھ وارد نہ ہوتا جو ہم نے ذکر کیا ہے تب بھی ان کی گراں قدر خدمات، ہجرت، جہاد، اسلام کی مدد، جانی و مالی قربانی، باپ اور بیٹے تک سے لڑ جانا، راہ اسلام میں مناصحۃ فی الدین، قوت ایمان اور عزم و ثبات، یہ سب اس پر شاہد عادل ہیں کہ وہ عادل اور تمام امت سے اعلیٰ و افضل ہیں، اور ان معدلین سے بھی جو ان کے بعد ان پر جرح کرنے پر آمادہ ہیں۔ یہی تمام علماء کا مسلک ہے۔ ابو زرعہ رازی کہتے ہیں کہ جب تم کسی ایسے آدمی کو دیکھو جو صحابہ میں سے کسی کی تنقیص کر رہا ہو تو سمجھ لو کہ وہ زندیق ہے اور اس پر اپنا ایمان رکھو کہ رسول حق ہے قرآن حق ہے اور جو کچھ وہ لایا برحق ہے اور یہ کہ وہ تمام لوگ جو ان پر جرح کرنا چاہتے ہیں وہ کتاب و سنت کو باطل کرنا چاہتے ہیں، اور بہتر یہ ہے کہ خود ان پر جرح کی جائے وہ سب کے سب زنادقہ ہیں۔"

لفظ عدالت ایک مشترک لفظ ہے جس کے مختلف معنیٰ ہیں لیکن محدثین کے نزدیک عدالت کے معنیٰ اجتناب عن الکذب کے ہوتے ہیں یعنی اس معنیٰ کر کے عادل اس شخص کو کہیں گے جو روایات میں دروغ بیانی نہ کرتا ہو۔ تمام صحابہ کو اسی معنیٰ میں عدول کہا جاتا ہے۔ یہ کسی محدث کا دعویٰ نہیں ہے کہ صحابہ کوئی بات انصاف کے خلاف نہیں کر سکتے یا ان سے کوئی فعل تقویٰ و طہارت کے خلاف صادر نہیں ہو سکتا یا وہ انبیاء کی طرح معصوم ہیں، یا وہ تمام گناہوں سے محفوظ ہیں۔ چنانچہ محدثین نے صاف صاف یہ تصریح کر دی ہے۔ علامہ سخاوی فتح المغیث میں اور قاضی شوکانی ارشاد الفحول[1] میں لکھتے ہیں:۔

"ابن انباری کا قول ہے کہ اتہامات کے ثبوت کے بعد یہ مطلب نہیں کہ صحابہ معصوم ہیں اور ان سے گناہوں کا سرزد ہونا محال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی روایتوں کو اسباب عدالت و ثقاہت کی چھان بین کئے بغیر قبول کر لینا چاہئے۔ بجز اس صورت کے جب وہ ایسے امر کا ارتکاب کریں جو روایات میں قادح ہو اور یہ ثابت نہیں ہے۔"

مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ لکھتے ہیں:۔

"اہل سنت کا یہ مقررہ عقیدہ ہے کہ صحابہ کل کے کل عادل ہیں۔ یہ لفظ بار بار بولا گیا ہے اور میرے والد مرحوم (شاہ ولی اللہ محدث دہلوی) نے اس لفظ کی حقیقت سے بحث کی تو یہ ثابت ہوا کہ اس موقع پر عدالت کے متداول معنی مراد نہیں ہیں۔ بلکہ صرف عدالت فی روایۃ الحدیث مراد ہے۔ اس کے سوا اور کچھ مراد نہیں، اور اس عدالت کی حقیقت "روایات میں اجتناب عن الکذب" ہے کیونکہ ہم نے تمام صحابہ کی سیرت کو خوب ٹٹولا، یہاں تک کہ ان لوگوں کی سیرت کا بھی تتبع کیا، جو خانہ جنگیوں، فتنوں اور لڑائی جھگڑوں میں شریک ہوئے، تو ہم کو معلوم ہوا کہ وہ رسول اللہ صلعم کے متعلق دروغ بیانی کو سخت ترین گناہ سمجھتے ہیں اور اس سے شدت کے ساتھ احتراز کرتے ہیں[2] (ظفر الامانی)۔"

---

[1] صفحہ ۶۷ مطبوعہ مصر، [2] مقدمہ اسوۂ صحابہ،

یہ ایک واضح امر ہے کہ مدارج روایت اور تفقہ و اجتہاد کے اعتبار سے صحابہ رضی اللہ عنہم کے مختلف طبقات تھے لیکن فضائل و مناقب کے لحاظ سے، خلفاء راشدین، ازواج مطہرات، مہاجرین اولین، انصار، اہل عقبہ و اہل بدر و مشاہد وغیرہ ایک دوسرے سے افضل ہیں۔ مزیت و فضیلت اضافی چیزیں ہیں ورنہ اس اختلاف مراتب کے باوجود مومن صالح ہونے میں تمام صحابہ برابر ہیں، اور سب کے سب اہل جنت ہیں۔ "وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ أُولَئِكَ الْمُقَرَّبُونَ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ"۔

کتاب و سنت کی اہم شہادتوں اور ائمہ کرام کی تصریحات کے بعد بھی اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ "صحابہ کی عدالت و ثقاہت غیر صحیح، قرآن کے خلاف اور محض عقیدتمندی کا فیصلہ ہے" تو حیرت کی انتہا نہیں رہتی کہ خدایا یہ کیا مصیبت ہے؟ اب تک تو یہی رونا تھا کہ محدثین نے جو کچھ الفاظ جرح و تعدیل رواۃ حدیث کے متعلق وضع اور استعمال کئے وہ محض ظن و تخمین تھے، اور ان کا فیصلہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا لیکن صحابہ کرام جن کی عظمت و بزرگی، جلالتِ شان اور تقدس وغیرہ پر تو خود قرآن ناطق ہے، جب ان حضرات رضی اللہ عنہم کے متعلق بھی فضا خراب کر دی جائے تو سمجھنا چاہئے کہ ایسا شخص اہل علم سے بہت دور ہے۔ ورنہ اگر تحقیق مدنظر ہوتی تو سب سے پہلے وہ قرآن کی آیات پر تدبر کرتا۔ وہیں سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ کی روشنی اس کے لئے شمع راہ ہوتی۔ اور رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کی تعدیل نہ صرف صحابہ کرام کے متعلق ملتی بلکہ تابعین کے بارے میں بھی سند ثقاہت ہاتھ آتی۔ "وخیر امۃ" الخ اور "امۃ وسطا" کے اولین مخاطب کا سراغ ملتا۔ "لَا يَسْتَوِي مِنكُم مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ ..... وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ" کا طغرائے امتیاز میزان عدل و قسط قرار پاتا۔ قرآن مجید کے عموم کے مطابق تو جملہ صحابہ و تابعین، صالح اور مومن قطعی طور پر ثابت ہیں۔ جو لوگ روایتوں سے صرف تاریخیت کے قائل اور حجت دینی کے منکر ہیں ان کو تو بہر حال صحابہ و تابعین کی عدالت و ثقاہت قرآن ہی سے ماننی پڑے گی۔ صحابہ کرام کے غیر ثقہ ہونے پر چاہے ہزاروں جرحیں احادیث و سیر سے پیش کی جائیں، مگر ان سے قرآن کے فیصلہ "رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ" وغیرہ آیات پر تو ذرہ برابر اثر نہیں پڑ سکتا۔ رہ گئے وہ لوگ جو روایتوں یعنی سنن و آثار نبوی کو حجت دینی

مانتے ہیں تو وہ نہ تو صحابہ کو معصوم سمجھتے ہیں نہ خطا و لغزش بشری سے پاک۔ ہاں خواہ مخواہ ان کی نیتوں کے متعلق سوء ظنی رکھنا جس پر نہ قرآن راضی نہ اللہ و رسول کا حکم، کسی طرح جائز نہیں رکھتے۔ مشاجرات صحابہ محض ایک اجتہادی غلطی تھی ورنہ واقعات شاہد ہیں کہ باوجود شدید اجتہادی اختلاف کے ایک دوسرے کا احترام فرماتے تھے۔ حضرت علیؓ حضرت عائشہؓ کو ام المومنین کہتے رہے۔ خود حضرت عائشہؓ جن کی برأت و تطہیر قرآن نے کی اور حضرت علیؓ جن کو آنحضرت صلعم نے بمنزلہ ہارونؑ کے کہا کیونکر غلطی فرما سکتے تھے۔ کیا قرآن اس ہستی کی برأت کر سکتا تھا جو فتنہ میں ملوث ہونے والی ہو؟ کیا پیغمبر ایسے شخص کو بمنزلہ ہارون کہتا جو باطل کے لئے جنگ و جدل کریں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ یہی وجہ تو تھی کہ باوجود ان باتوں کے کوئی ایک صحیح واقعہ موجود نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ یہ حضرات ایک دوسرے کو (معاذ اللہ) برا کہتے یا سمجھتے تھے۔

یہ ہے واقعہ کی اصلی تصویر اور صحابہ کی عدالت کی حقیقی تعبیر۔ کیا یہ بات آج کل کے آزاد اور نام نہاد مفسرون کے لئے حیرت انگیز نہیں ہے کہ حضرت موسیٰؑ جو بحکم قرآن نبی و رسول ہیں، ان سے "لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي" اور "أَلْقَى الْأَلْوَاحَ وَأَخَذَ بِرَأْسِ أَخِيهِ يَجُرُّهُ إِلَيْهِ" کا صدور ہو جائے۔ انتہائی غیظ و غضب میں حضرت ہارون کی ڈاڑھی اور سر کے بال پکڑیں اور کھینچنے لگیں۔ یہی کہا جائے گا نا کہ (حاشا) ہارون کی اہانت کی نیت سے ایسا نہیں کیا تھا؟ اور حضرت موسیٰؑ اس حالت میں شرعاً معذور تھے۔ فرط غضب اور ہنگامۂ دار و گیر میں الواح ہاتھ سے چھوٹ گئیں جسے عدم تحفظ کی وجہ سے تغلیظاً القا سے تعبیر فرمایا گیا کیونکہ بظاہر "خُذْهَا بِقُوَّةٍ" کا امتثال نہ کر سکے۔ مگر چونکہ ان دونوں معاملات کی سطح جو ہارون یا الواح کے متعلق ظہور میں آئی بہر حال صورت پسندیدہ نہ تھی گو موسیٰؑ باعتبار نیت معذور تھے، اس لئے آئندہ "رَبِّ اغْفِرْ لِي" کہکر حق تعالیٰ سے عفو کی درخواست کی یا اس کے سوا اور کوئی تاویل ہوگی؟ یہ باتیں ان حضرات کے لئے زیادہ غور کرنے کی ہیں جو محض قرآن کو آڑ بنا کر عصمت انبیاء، و عظمت صحابہ کا نام لے کر سنن و آثار نبوی کو مجروح کرنے کے عادی ہیں۔ ایک طرف تو زبانی ادعائے قرآن دانی اور دوسری جانب علوم و فنون اسلامیہ سے بیگانگی، ہجر و فقدان کا یہ عالم کہ اگر کوئی روایت ذرا بھی بظاہر معارض نظر آئی جمع و توفیق کی بیسیوں

مشکلوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور فوراً یہ کہنا شروع کر دیا جاتا ہے کہ قرآن کے خلاف ہے عقل کے منافی ہے، آنحضرت صلعم کی عصمت اور صحابہ کرام کی عظمت و رفعت، ازواج مطہرات کی عفت و طہارت کا مقام اس سے بلند ہے سننے والا مرعوب ہوجاتا ہے اور یارانِ طریقت اپنا کام کر جاتے ہیں۔ حالانکہ سیدھی سی منطق ہے کہ اگر قول و فعل پیغمبر صلعم کا ہے تو وہ قیامت تک بیان بالا کے مخالف نہیں ہوسکتا۔ صحیح عقل و نقل میں کبھی تعارض نہیں رہا ہے۔

یہ حال ہے ان بخاری وقت لوگوں کا۔ یہ حضرات تو پیغمبر اور صحابہ وغیرہ کی عظمت و عصمت کو سمجھیں اور نہ سمجھیں تو امام ابوحنیفہ، مالک، شافعی، احمد بن حنبل، بخاری، مسلم، علی بن المدینی، یحیٰی بن سعید القطان، ابو حاتم رازی، ابوزرعہ، عبداللہ بن مبارک، یحیٰی بن معین، علامہ ابن حزم، ابن قیم، شاہ ولی اللہ وغیرہا یہ ایک ایسی جماعت ہے جو اسلام کے لئے سخت مضر اور سم قاتل ہے۔ اس کے دام تزویر میں آکر بڑے بڑے عباد و زہاد اور مغرب زدہ سعادت ازلی سے محروم ہوجاتے ہیں۔ ایسی بے اصول جماعت سے گفتگو ہو بھی تو کیوں کر؟۔

بحث و مناظرہ سے بجائے اس کے کہ حق کو حق سمجھا جائے زیادہ تر معاملہ برعکس ہی ہوتا ہے، ورنہ قرآنِ کریم تو بآواز بلند مدعی ہے کہ اصحاب محمد رسول اللہ صلعم کی قدوسیت توریت و انجیل میں بھی بیان ہوئی ہے ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:۔

"وہ کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا اور لاکھوں قدوسیوں میں سے آیا، .... اس کے سب مقدس لوگ تیرے ہاتھ میں ہیں،، (استثنا، باب ۳۳ صفحہ ۲۰۱)

کیا مذکورہ پیشینگوئی فتح مکہ کے دن پوری نہیں ہوئی؟ قرآن کو پڑھو تو اس میں اصحاب رسول اللہ کے ایک ایک خدوخال کو واضح کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ آخر اس سے کون لوگ مراد ہیں؟ کیا اس زبردست شہادت کے بعد بھی کسی کو صحابہ کی عدالت و ثقاہت میں شبہ رہتا ہے؟ کون مسلمان ہے جو پنجوقتہ نمازوں میں سورہ فاتحہ نہ پڑھتا ہوگا مگر کیا کبھی اس حقیقت پر بھی غور کیا گیا کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے

کن کے راستے کی طلب مراد ہے اور وہ کون لوگ ہیں جن پر انعام واکرام باری کی بارش ہوئی اور منعم علیہم قرار پائے؟ اس کا جواب قرآن خود دیتا ہے "مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ"۔ کیا صالح ہونے میں خلفاء راشدین کے علاوہ صحابہ کی جماعت داخل نہیں ہے؟ پھر کیا وجہ ہے کہ ان کی اجتہادی غلطیوں کو نفاق و شقاق، (معاذاللہ) عدوان اور سرکشی سے تعبیر کرکے اپنے نامۂ اعمال کو خراب کیا جاتا ہے "کل مجتهد مصيب والمصيب واحد والمخطي معذور بل ماجور" کی توجیہ ایک منصفانہ اور عالمانہ فیصلہ ہے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہی حق پسندانہ بات فرمائی ہے کہ "تلك دماء طهر الله منها سيوفنا فلا نخضب بها السنتنا"[1]۔ تلاش حق وصداقت اور غور وفکر کے لئے اتنے اشارات کافی ہیں، بشرطیکہ تحقیق مد نظر ہو۔

سنن وآثار نبوی کے مرکزی مقامات اور ان کی نشر واشاعت

مذکورہ مباحث کے بعد یہ بتا دینا ضروری ہے کہ حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے آنحضرت صلعم کے وصال کے بعد مختلف مقامات پر اپنے مراکز اور چھاؤنیاں قائم کرلی تھیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ خدا کی راہ میں جہاد وغیرہ کے لئے نکلے۔ لوگ ان کے پاس جمع ہوتے۔ وہ ان کے سامنے خدا کی کتاب اور پیغمبر کی سنت کو ظاہر فرماتے اور کسی چیز کو کبھی نہ چھپاتے۔ مکہ، مدینہ، کوفہ، شام، بصرہ، یمن، جزیرہ، خراسان، مصر میں صحابہ کی جماعت موجود تھی لیکن سیاسی اور مذہبی اعتبار سے اول الذکر ہر سہ مقامات کو خاص اہمیت حاصل تھی۔

صحابہ میں حضرات خلفاء اربعہ اور ابن مسعودؓ، ابی بن کعبؓ، معاذ بن جبلؓ، زید بن ثابتؓ، عبدالرحمن بن عوفؓ، عمار بن یاسرؓ، حذیفہؓ، سلمانؓ، ابو درداءؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ فقہائے صحابہ کے نام سے موسوم ہیں اور اکثر آنحضرت صلعم کے عہد میں فتویٰ دینے کے مجاز تھے۔ ان کے علاوہ مفتیان صحابہ کی تعداد ۱۲۰ سے متجاوز ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ، انس بن مالکؓ، جابرؓ بن عبداللہ، عبداللہ بن عمرؓ، ابو سعید خدریؓ، عائشہؓ، علامہ ابن جوزی کی

[1] ارشاد الفحول

اصطلاح میں رواۃ صحابہ ہیں۔[1]

سنن و آثار نبوی سے جو احکامات ثابت ہیں بقول علامہ خطلی صرف حضرت ابو ہریرہؓ سے ڈھائی ہزار مروی ہیں۔[2] اور جنھوں نے سنن ابی داؤد و جامع ترمذی، الامام ابن دقیق العید، منتقی الاخبار لابن تیمیہؒ وغیرہ کا مطالعہ کیا ہے وہ اندازہ کرسکتے ہیں کہ احکاماتِ اسلامی کی فہرست کس درجہ طویل اور معاشرتی و تمدنی زندگی کو حاوی ہے لیکن بقول علی بن المدینی جس کو ابوبکر خطیب نے روایت کیا ہے تین شخص ایسے ہیں جن پر احکامات نبوی صلعم کا علم منتہی ہوتا ہے، وہ درج ذیل ہیں :-

(۱) حضرت عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلبؓ۔ آپ ہجرت کے دو سال پہلے پیدا ہوئے اور رسول اللہ صلعم نے آپ کے لئے دعا کی "خدا ان کو دین میں فقیہ بنا اور ان کو تاویل کتاب الہٰی سکھا" حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ ابن عباس قرآن کے کس قدر اچھے ترجمان ہیں۔ اگر ان کو ہمارا سن و سال ملتا تو ہم میں کوئی ان کا ہمسر نہ ہوتا۔ معمرؒ کا قول ہے کہ ابن عباس کا عام علم تین بزرگوں سے ماخوذ ہے۔ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابی بن کعبؓ۔ شوق کا یہ عالم تھا کہ خود حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ میں جب یہ سنتا تھا کہ ایک آدمی کے پاس حدیث ہے تو اس کے ہاں جاتا تھا اور اس کے انتظار میں بیٹھ جاتا تھا یہاں تک کہ جب وہ نکلتا تو میں اس سے پوچھ لیتا۔" تفسیر اور فقہ میں اہل مکہ کے علم کا دارومدار حضرت ابن عباس ہی پر ہے۔ آپ نے ۶۸ھ میں بمقام طائف وفات پائی۔[3] آپ کے ممتاز تلامذہ میں سعید بن جبیر، عطار بن ابی رباح، عکرمہ، مجاہد، جابر، زید، طاؤسؒ وغیرہ ہیں۔ ان تمام کے علم کا سلسلہ عمرو بن دینار پر منتہی ہوکر روئے زمین پر چھا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے فتاووں کو مامون عباسی کے پوتے نے جمع کرایا تو ۲۰ کتابیں ہوئیں۔[4]

(۲) حضرت زید بن ثابت کاتب الوحیؓ۔ آپ کے والد کا نام ضحاک تھا اور انصار کے قبیلہ بنو نجار سے تعلق رکھتے تھے۔ رسول اللہ صلعم جب مدینہ آئے تو آپ کی عمر ۱۱ سال کی تھی۔ سب سے پہلے آپ نے غزوۂ خندق میں شرکت کی۔

---

[1] تلقیح فہوم الاثر [2] فصول الحواشی [3] تاریخ فقہ اسلامی [4] المدخل لابن بدران

تبوک کی جنگ میں بنو مالک بن النجار کا جھنڈا حضرت عمارہ بن حزم کے ہاتھ میں تھا لیکن رسول اللہ صلعم نے ان سے لے کر حضرت زید بن ثابت کے حوالہ کر دیا۔ عمارہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا میرے متعلق آپ کو کوئی بات معلوم ہوئی ہے؟ فرمایا "نہیں لیکن قرآن مقدم ہے اور زید نے تم سے زیادہ قرآن پڑھا ہے"۔ حضرت زید بن ثابتؓ رسول اللہ صلعم کی خدمت میں کاتب کی خدمت انجام دیتے تھے۔ حضور کے پاس سریانی زبان میں بہت سے خطوط آتے تھے۔ اس لئے حضرت زید بن ثابت نے آپ کے ارشاد سے سریانی زبان سیکھی۔ آنحضرت صلعم کے بعد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بھی کاتب رہے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو تین بار مدینہ میں اپنا جانشین بنایا۔ حضرت عثمانؓ بھی جب حج کو جاتے تھے تو آپ کو اپنا جانشین کر جاتے تھے۔ آپ صحابہ میں سب سے زیادہ فرائض کے عالم تھے چنانچہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ زید تم میں سب سے زیادہ علم فرائض کو جانتے تھے۔ آپ صحابہ میں بہت بڑے عالم اور راسخین فی العلم میں تھے۔

آپ جمع وترتیب قرآن کے رکن اعظم ہیں۔ آپ کا عمل یہ تھا کہ صرف اپنی یاد اور اپنے لکھے ہوئے اجزا ہی پر قناعت نہیں فرماتے تھے بلکہ اور حفاظ کی یاد اور دوسرے کاتبوں کے صحیفوں اور اُن اجزا سے بھی آپنے مدد لی جو رسول صلعم کے گھر میں لکھے ہوئے موجود تھے۔ آپنے مہاجرین اور انصار کے اتفاق سے اس مجموعہ کو مکمل کیا اور حضرات شیخینؓ کے ذریعہ خدا نے اپنی اس ضمانت "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ" کو پورا فرمایا۔ حضرت عثمانؓ نے جب اپنے زمانہ میں اس کام کے لئے لوگوں کو متعین فرمایا تو حضرت زید بھی بحیثیت رکن اعظم شریک تھے۔ بہت سے صحابہؓ و تابعین نے آپ سے روایت حدیث کی مثلاً فقہاء سبعہ مدینہ منورہ، قبیصہ بن ذویب، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن، سالم بن عبداللہ، ابان بن عثمان وغیرہ۔ ان تمام لوگوں کا علم تین حضرات پر منتہی ہوتا ہے، ابن شہاب[1]، بکر بن عبداللہ[2] الاشج اور ابوالزناد[3]۔ پھر ان تمام کا علم حضرت امام مالک تک پہنچ کر دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل پڑتا ہے۔

(۳) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہذلی۔ بنو زہرہ کے حلیف اور قدیم الاسلام ہیں۔ آپ کا بیان ہے کہ میں نے اپنے آپ کو چھ مسلمانوں میں کا چھٹا مسلمان پایا۔ اُس وقت سطح زمین پر ہم لوگوں کے سوا کوئی اور مسلمان نہ تھا۔

مکہ میں سب سے پہلے آپ ہی نے باعلان قرآن مجید پڑھا۔ جب آپ اسلام لائے تو رسول اللہ صلعم نے آپ کو اپنی خدمت میں رکھ لیا۔ آپ خدمت کرنے لگے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تم کو اندر آنے کی اجازت لینے کی ضرورت نہیں، تمھاری اجازت صرف یہ ہے کہ تم میری بات سُن لو اور پردہ اٹھا ہوا ہو۔ چنانچہ وہ آپ کے پاس اندر آتے جاتے، آپ کو جوتا پہناتے، آپ کے ساتھ آگے آگے چلتے، جب آپ غسل فرماتے تو پردہ کرتے، اور جب آپ سوتے تو آپ کو بیدار کرتے۔ حبشہ اور مدینہ دونوں جگہ ہجرت کی اور دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھی۔ رسول اللہ کے ساتھ بدر، احد، اور خندق، بیعۃ الرضوان اور تمام لڑائیوں میں شریک ہوئے اور آپ کے بعد معرکۂ یرموک میں شرکت کی۔ آپ سے بہت سے صحابہ اور تابعین نے حدیث کی روایت کی ہے۔ حضرت حذیفہؓ سے کہا گیا کہ ہم کو ایسا شخص بتائیے جو طور و طریقے میں آنحضرت صلعم سے سب سے زیادہ قریب ہوتا کہ ہم اس سے حدیث سنیں اور اخذ کریں۔ بولے طرز و روش میں آنحضرت صلعم سے سب سے زیادہ قریب ابن مسعود ہیں۔ اصحابِ محمدؐ میں جو لوگ محفوظ ہیں وہ جانتے ہیں کہ ابن ام عبد، سب سے زیادہ مقرب بارگاہِ الٰہی ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اگر میں کسی کو بغیر مشورہ خلیفہ بناتا تو ابن ام عبد کو بناتا۔ حضرت عمر نے آپ کو کوفہ بھیجا اور باشندگانِ کوفہ کو لکھا کہ "میں نے عمار بن یاسر کو امیر اور عبداللہ بن مسعود کو معلم اور وزیر بنا کر بھیجا ہے۔ یہ دونوں رسول اللہ صلعم کے شریف ترین بدری صحابی ہیں۔ ان کی پیروی اور اطاعت کرو اور ان کا کہنا مانو۔ میں نے عبداللہ بن مسعود کو بھیج کر تمھارے ساتھ ایثار سے کام لیا ہے۔" آپ اہل کوفہ کے معلم اور قاضی کی حیثیت سے وہاں مقیم رہے اور وہاں کے باشندوں نے آپ سے اخذ حدیث کیا۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ عبداللہ بن مسعود نے قرآن پڑھا۔ اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھا۔ مذہب کے فقیہ اور حدیث کے عالم تھے۔ حضرت عمرؓ و حضرت علیؓ سے باقاعدہ علم شریعت حاصل کیا تھا۔ حضرت عثمان غنی کے عہد خلافت میں ۳۲ھ میں آپ کی وفات مدینہ منورہ میں ہوئی۔[1]

اس موقع پر یہ جاننا ضروری ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود سے علقمہ، اسود، عبیدہ، حارث بن قیس، مسروق،

---

[1] تاریخ فقہ اسلامی و کوکب الدری

عمرو بن شرحبیل وغیرہ نے علوم حاصل کئے اور ان حضرات سے ابراہیم نخعی اور شعبی نے اور ان سے امام ابوحنیفہ، ابو اسحٰق اور اعمش نے اور ان سے حضرت سفیان ثوری وغیرہ نے۔ علمائے کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے تلامذہ کی فہرست بہت ہی طویل ہے (تفصیل کے لئے "معرفۃ علوم الحدیث" للحاکم وغیرہ ملاحظہ ہو) ان سے صدہا بلکہ ہزارہا مخلوق الٰہی نے سنن و آثار نبوی کی تعلیم حاصل کی اور اسی علم کے ذریعہ سے معاملات مذہبی و سیاسی کو انجام دیا اور پھر یہ علوم دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے۔ (باقی)

ترجمان القرآن کے سابق پرچے

ترجمان القرآن کے مندرجۂ ذیل سابق پرچوں کی دفتر ہذا کو ضرورت ہے۔ جو حضرات ان پرچوں کو قیمتاً فروخت کرنا چاہتے ہوں۔ یا جنکے پاس یہ پرچے زائد موجود ہوں وہ براہ کرم ان پرچوں کو بذریعہ ڈاک ہمارے پاس روانہ کردیں۔ اور "لفافہ" پر اپنا مکمل پتہ تحریر فرما دیں تاکہ ۸/ فی پرچہ کے حساب سے ان کو قیمت روانہ کی جا سکے۔

رسائل و اخبارات کے اڈیٹر صاحبان سے بھی گزارش ہے کہ اگر وہ مکمل فائل نہ رکھنا چاہتے ہوں۔ اور ان کے پاس یہ پرچے ہوں تو وہ بھی ان پرچوں کو بھجوا کر قیمت وصول کرلیں۔

سال ۱۳۵۲ھ	جلد۲	عدد ۱	ماہ محرم	سال ۱۳۵۶ھ	جلد۱۰	عدد۳	ماہ ربیع الاول
"	جلد۳	عدد۲	ماہ شعبان	"	"	عدد۴	ماہ ربیع الثانی
"	جلد۳	عدد۳	ماہ رمضان	"	جلد۱۱	عدد۲	ماہ شعبان
سال ۱۳۵۴ھ	جلد۶	عدد۱	ماہ محرم	"	"	عدد۳	ماہ رمضان
"	"	عدد۲	ماہ صفر	سال ۱۳۵۷ھ	جلد۱۲	عدد۵	ماہ جمادی الاولیٰ
"	"	عدد۳	ماہ ربیع الاول	"	"	عدد۶	ماہ جمادی الاخریٰ
"	"	عدد۴	ماہ ربیع الثانی	"	جلد۱۳	"	ماہ رجب
سال ۱۳۵۶ھ	جلد۱۰	عدد۲	ماہ صفر				

منیجر

ظاہر ہے کہ جب وطن کی محبت جزوِ ایمان ہے تو وطن کی راہ میں لڑے اور مرے بغیر (یعنی جہاد کئے اور سر میں سودائے شہادت رکھے بغیر) ایمان کی تکمیل کیوں کر ہو سکتی ہے۔ اور کسی مسلمان کے خلوصِ ایمان کے ثبوت میں اس کی وطن پرستی سے بڑھ کر اور کون سی دلیل ہو سکتی ہے؟

لیکن کیا حبّ وطن کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر یہی ہے؟ سطورِ ذیل میں ہم اسی سوال پر غور کرنا چاہتے ہیں، اور قطع نظر اس سے کہ فقیہانِ قوم کیا کہتے ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ خدا اور اس کا رسول کیا کہتا ہے۔

حبّ وطن کا وجود ایک بدیہی اور مسلّمہ حقیقت ہے، ایسی بدیہی اور مسلّم کہ اس پر کسی عقلی یا نقلی دلیل پیش کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ہر انسان کی طبیعت بجائے خود اس پر گواہ ہے۔ اسے جتنا لگاؤ کافر کی فطرت سے ہے اتنا ہی ایک مومن کی فطرت سے بھی ہے۔ اس کے وجود سے بڑے سے بڑے صاحب ایمان کا دل و دماغ خالی نہیں ہو سکتا۔ اس نے تو اپنے وجود کا اعلان اس قلب اور زبان سے کرایا جسے مہبطِ وحی اور لسانِ وحی کہا جاتا ہے۔ مکہ سے نکلتے وقت ایک طرف چشمِ مبارک سے غم و حسرت کے آنسو بہ رہے تھے، دوسری طرف زبان بے اختیار کہہ رہی تھی کہ "اے مکہ تو مجھے ساری دنیا سے زیادہ عزیز ہے، پر کیا کروں تیرے ہی فرزند تیری آغوش سے مجھے محروم کر رہے ہیں"۔ اور پھر بلال رضی اللہ عنہ کے وہ نغماتِ درد تو آج تک ضرب المثل ہیں جو ان کی مضطرب روح کی گہرائیوں سے یادِ وطن میں نکل نکل کر مدینہ کی پہاڑیوں میں گونجا کرتے تھے۔ غرض ایمان یا عدمِ ایمان کوئی شئے بھی اس جذبۂ بشری پر اثر انداز نہیں ہو سکتی، بعینہٖ اسی طرح جس طرح ماں کی، باپ کی، بیٹی کی، بیوی کی، بھائی کی، بہن کی، احباب اور اقارب کی، کسی کی بھی محبت پر ان اعتقادی نزاعات کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ یہ تو سب کے سب خالص بشری جذبات ہیں جو بلا لحاظ کفر و ایمان بنی نوعِ انسان کی سرشت میں صناعِ ازل نے اس وقت سے ودیعت رکھے ہیں جب خود انسان کو ان کے وجود کا احساس بھی نہ تھا۔ چنانچہ قرآن حکیم خود اس حقیقت کو تسلیم کر کے فطرتِ انسانی کی ساخت کے متعلق فرماتا ہے:-

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ   بنی نوعِ انسان کو فطرتاً مرغوباتِ دنیوی یعنی بیویوں،

النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ الخ (آل عمران رکوع ۲) بیٹوں، سونے چاندی کے بڑے بڑے ڈھیروں، عمدہ عمدہ گھوڑوں، مویشیوں اور کھیتوں کی محبت بھلی معلوم ہوتی ہے۔

وطن کی محبت بھی اس "حُبُّ الشَّهَوَاتِ" کے دائرہ سے خارج نہیں۔ حُبِّ شہوات سے مراد ہے مادیات کی محبت۔ وطن کی محبت بھی دیگر تعلقات دنیوی کی طرح ایک مادی اور دنیوی تعلق کا نام ہے۔ بلکہ اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو انھیں تمام اشیا کی محبت ہی حب الوطن کی محرک اور علت بلکہ عین حبِّ وطن ہے۔ انسان جس ماحول اور سوسائٹی میں، جن احباب اور متعلقین کے درمیان اور جن لوازم زندگی کے ساتھ رہتا سہتا ہے، ان سے اسے ایک خاص انس پیدا ہو جاتا ہے، اسی انس کا دوسرا نام حُبِّ وطن ہے۔ اس انس کے وجود کو قرآن تمام نوع انسانی یعنی "النَّاس" کی جبلت میں مرکوز بتاتا ہے۔ اس "النّاس" کے فرد جس طرح ابوجہل اور ابولہب ہیں اسی طرح صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ بھی۔ کسی کی خلقت "زُيِّنَ لِلنَّاسِ" کے حکم عام سے باہر نہیں ہے۔ پھر ان عام جذباتِ انسانی کو کفر و ایمان کے جھگڑوں سے کیا تعلق؟۔

مادی تعلقات کے متعلق اسلام کا نظریہ سب سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حبِّ وطن کے مخصوص تعلق کے بجائے عام تعلقاتِ دنیویہ کے بارے میں ہم اسلام کا نقطۂ نظر سمجھ لیں۔ کیونکہ زیر بحث مسئلہ بھی اسی ضمن میں خود بخود حل ہو جائیگا۔ اور یوں بھی قرآن جب کبھی ان دنیوی تعلقات اور مادیات سے متعلق جذباتِ انسانی کے بارے میں کچھ فرماتا ہے تو زیادہ تر ان کی مجموعی حیثیت کو ہی سامنے رکھ کر فرماتا ہے کسی تعلق کی جداگانہ حیثیت اس کے دائرہ بحث میں بہت کم آتی ہے۔

یقیناً جہاں تک ان جذبات کے نفس وجود کا تعلق ہے، وہ دیر و حرم کے جھگڑوں سے بے نیاز ہیں۔ وہ اپنا یہ حق ہر شیخ و برہمن سے حاصل کئے ہوئے ہیں۔ محل نزاع یہ نہیں ہے کہ یہ جذبات آدمی میں ہونے چاہئیں یا نہیں، بلکہ یہ ہے کہ ان جذبات کی جائز حد کیا ہے، اور انسان کے نفس پر ان کے حقوق کس قدر ہیں۔

اسی سوال پر پہنچ کر اسلام اور جاہلیت کے راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اسلام ہر مادی تعلق کو چند حدود سے مقید کرتا ہے اور جاہلیت انھیں توڑنے پر اصرار کرتی ہے۔ (حب وطن کے بارے میں بھی دونوں کے تصورات بالکل ایسے ہی جداگانہ واقع ہوئے ہیں۔ جاہلیت وطن ہی کو دین و ملت بلکہ خدا بھی سمجھ لے تو بعید نہیں، مگر اسلام وطن کی محبت کو نہ اتنی تقدیس کا مستحق سمجھتا ہے اور نہ اسے استنے غیر محدود حقوق دیتا ہے)۔ اسلام دنیا کی تمام مرغوبات سے حظ اٹھانے کی اجازت تو دیتا ہے لیکن اپنے نظام اور اصولِ کار میں کسی مادی شئے کے اثر اور اقتدار کو قبول نہیں کرتا۔ بالفاظ دیگر وہ دنیا کو برتنے تو دیتا ہے لیکن پوجنے نہیں دے سکتا۔ اس کے دستور العمل (قرآن) کے قریباً ہر صفحہ میں یہ وضاحت موجود ہے۔ چنانچہ آیت مذکورہ بالا کے آخری الفاظ ہی میں ارشاد ہوتا ہے ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ یعنی یہ دنیا اور اس کی تمام چیزیں جن کی طرف میلان انسان کی فطرت میں داخل ہے "متاعِ قلیل" ہیں۔ ان سے تمتع تو ضرور کرو، لیکن انھیں کو مقصود بالذات سمجھ کر ان کی پرستش میں نہ لگ جاؤ، تمھاری منزلِ مقصود اس سے بلند تر ہے۔ ان حیاتِ دنیوی کی زینتوں پر اگر تم فریفتہ ہو گئے اور انھیں کے ہاتھوں میں اپنے نظامِ حیات کی باگیں دے دیں تو یقین کرو تم مقصدِ حیات کی تکمیل میں ناکام اور زندگی کی آزمائش گاہ میں فیل ہو گئے۔ کیونکہ ہم نے تمھیں اس واسطے نہیں پیدا کیا کہ دنیوی علائق کی سرمستیوں میں غرق ہو جاؤ، بلکہ اس آزمائش کے لیے پیدا کیا ہے کہ ان بندشوں کے اندر بھی کون اپنی عقل اور روح کو آزاد اور زندہ رکھتا ہے اور ان میں گرفتار ہونے کے بجائے ان سے خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوتا ہے۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا — وہ اللہ جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تاکہ تمھیں آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون اچھے اعمال کرتا ہے۔

اور یہ آزمائش اس وقت تک نہیں ہو سکتی تھی جب تک کہ اس امتحان گاہ (دنیا) کے اندر بنی آدم کے لیے مزلّاتِ اقدام نہ پیدا کیے جاتے۔ چنانچہ وہ پیدا کیے گئے اور اس کثرت اور قوت کے ساتھ کہ آدمی میں اگر حقیقی

بینائی ہو تو اپنی کمزوریوں کے مقابلہ میں ان کی بے پناہی اور آفاق گیری کو دیکھ کر چیخ اٹھے۔ وہ مزلات کیا ہیں؟ یہی مرغوباتِ نفس جن کی طرف آیتِ بالا میں اشارہ کیا گیا ہے، اور جن کا ایک جامع نام کتاب اللہ نے "متاعِ حیاتِ دنیا" رکھا ہے۔ یہی متاعِ دنیا انسان ظلوم وجہول کے لیے مزلۂ اقدام ہے۔ یہ نہ ہوتی تو یہ عالم عنصری، دار ابتلا بھی نہ بنتا۔ اسی لیے انسان کو بار بار چوکنا رہنے کی تاکید کرتا ہے:۔

فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۔ (لقمان - ۴)

پس تمہیں یہ دنیوی زندگی (اصل مقصد اور انجام) کی طرف سے دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ خدا کے بارے میں فریب کار شیطان تمہیں دھوکے دینے پائے

اور پھر یہی وہ خطرناک پہلو ان زخارفِ ارضی کا ہے جس کی وجہ سے انہیں قرآن میں جگہ جگہ "فتنہ" کہا گیا ہے، اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (تغابن - ۲) وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (انفال - ۳) "فتنہ" قرآنی اصطلاح میں ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جن میں خیر و شر دونوں پہلو موجود ہوتے ہیں۔ اگر انسان ان کے حدود پہچان کر ان کا صحیح استعمال اور استفادہ کرے تو وہ اس کے لیے سراپا خیر ثابت ہوتی ہیں لیکن اگر اس نے اس امتیاز اور استعمال میں غلطی کی تو یہی چیزیں اس کے حق میں شر بن جاتی ہیں، اور انسان اپنی آزمائش میں ناکام ہو کر معتوبِ الٰہی قرار پاتا ہے۔ اور دنیا کی یہ ساری نعمتیں اس کے لیے دشمن ثابت ہوتی ہیں۔ اسی نقطۂ نظر سے انہیں انسان کا "عدو" بھی کہا گیا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ (تغابن - ۲) یعنی اے ایمان والو تمہاری بیویوں اور بچوں ہی میں سے تمہارے دشمن ہیں، پس ان کی محبت کے فتنوں سے بچتے رہو۔ کیونکہ انسان کے راہ قسط و عدل سے ہٹنے کا سب سے بڑا واحد سبب یہی عشقِ مال اور حبِّ عیال ہی تو ہے جو انسان کو ادائے فرض سے روکتا ہے۔

یہیں سے عملاً کافر اور مومن کا امتیاز شروع ہوتا ہے۔ کافر، مشرک اور ملحد انہیں چیزوں میں اپنے کو گم کر دیتے ہیں۔ یہ دنیا اور اس کے علائق ان کی روح کو، ان کے قلب کو، ان کے دماغ کو اپنی اسیری میں اس طرح لے لیتے ہیں کہ وہ انہیں کو حاصلِ زندگی اور منتہائے حیات سمجھنے لگتے ہیں، یعنی شقاوت کے اس درجۂ کمال

پر پہنچ جاتے ہیں جسے قرآن بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا سے تعبیر کرتا ہے۔ اور ان کے برعکس مومن اس متاع ارضی کو اپنے دل و دماغ کا معبود نہیں بناتا۔ وہ ان سے ایک فطری رغبت تو ضرور رکھتا ہے مگر یہ رغبت اس کو اصل مقصد حیات سے بیگانہ نہیں کرسکتی۔ جہاں متاع دنیا نے معبودیت کا مطالبہ کیا اور مومن کے لیے وہ "عدو" کے حکم میں ہوگئی۔ پھر مومن کا فرض ہوجاتا ہے کہ اپنے ہاتھ سے اس "عدو" کے حلق پر چھری پھیر دے، خواہ یہ چھری اس رغبت کے ساتھ ساتھ خود اس کے دل کے ٹکڑے ہی کیوں نہ کرڈالے۔ بیٹے سے بڑھ کر اس آسمان کے نیچے اور کون سی چیز محبوب بنائی گئی ہے؟ لیکن جب اسی محبوب ترین متاع کو طوفان کی موجیں نگلنے کے لیے لپکتی ہیں اور وقت کا سب سے بڑا خدا پرست انسان باوجود پیغمبرانہ عزیمت کے پدرانہ محبت سے مغلوب ہوکر بیتابانہ کبھی بیٹے کو پکارتا ہے کہ يَا بُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا اور کبھی آسمان کی طرف مترحم نگاہیں اٹھا کر کہتا ہے کہ يَا رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ تو معلوم ہے کہ خدا کی بے نیاز عدالت سے اس درخواست کا کیا جواب ملتا ہے؟ عقیدت اور ممتا کی اس فطری کشمکش پر پیغمبر کو کن لفظوں میں تنبیہ ہوتی ہے؟ صدا آتی ہے کہ یا نُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (ہود - ۴) اے نوحؑ! بیٹے کے ساتھ تمہاری شیفتگی مسلم، مگر یہ حق و باطل کے امتیاز کا وقت ہے، اس وقت تمہارے بشری جذبات کا اقتضا کوئی چیز نہیں۔ خبردار جذبات کے طوفان میں تمہارے پائے ثبات و استقامت کو لغزش نہ ہونے پائے۔ اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ۔ حق کی راہ میں جو محبت حائل ہو اس کو دل میں رکھنا جاہلوں کا کام ہے، ایمان کی امتحان گاہ میں ناکام ہونے والوں کی راہ ہے۔ اس وقت بیٹے کی محبت ایک خطرناک فتنہ کی شکل میں تمہارے سامنے آئی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو اپنے پیروں سے کچل کر رکھ دو۔ حق پرستی کا دشمن ہوکر تمہارا بیٹا، تمہارا لختِ جگر ہونے کے باوجود، تمہاری کسی محبت اور سفارش کا مستحق نہیں، حتیٰ کہ وہ اب تمہارا بیٹا بھی نہیں کہا جاسکتا، لہٰذا تم اپنے اس جگر کے ٹکڑے کو نہنگ اجل کے منہ میں جانے دو۔

اسوۂ ابراہیمی کو لیجیے۔ باپ سے بڑھ کر مخلصانہ ہمدردی اور تعظیم کا مستحق کون ہے؟ لیکن جب توحید پرست بیٹے کو یقین ہو جاتا ہے کہ باپ کی سیاہ فطرت پر شعاع حق کا انعکاس ناممکن ہے تو وہ نہ صرف اس سے ترکِ موالات کرتا ہے بلکہ اس کے لیے ہدایت اور مغفرت کی تمنا بھی اپنے اوپر حرام کر لیتا ہے، اور باپ بیٹے جیسا گہرا فطری (لیکن مادی) تعلق ایک منٹ کے لیے بھی اس کے ارادہ میں تزلزل نہیں پیدا کرتا۔

اور قریب آئیے، اسوۂ فاروقی پر نگاہ ڈالیے کہ اس سراپائے ایمان کی سیرت بجائے خود حقیقتِ اسلام کی ایک مکمل اور خالص تصویر ہے۔ بدر کے میدان سے اسیرانِ جنگ گرفتار ہو کر آتے ہیں۔ دربارِ نبوت میں معاملہ پیش ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ کیا کیا جائے۔ سب سے پہلے سیدنا عمرؓ کی آواز آتی ہے کہ یا رسول اللہ میں جانتا ہوں کہ ہمارے سامنے یہ سب ہمارے اپنے ہی دست و بازو بلکہ دل و جگر پارے بزنجیر کھڑے ہیں لیکن ہیں یہ سب کے سب حق کے دشمن اور توحید سے برگشتہ۔ لہٰذا حکم دیجیے کہ ہم میں سے ہر ایک خود اپنے قریبی عزیز کی گردن مارے۔ کیونکہ ہمارے ان کے لاکھ نسبی اور وطنی تعلقات سہی، مگر ایمان کے دشمن کسی صلہ رحمی، اور ان کی محبت کسی رعایت کی مستحق نہیں۔ اس مشورہ پر خواہ عمل نہ ہوا ہو لیکن اس معاملہ کے متعلق حاکم اعلیٰ کا جو فیصلہ آیا، اس کی روشنی میں کون ہے جو اس مشورہ کی ایمان نوازی اور صحت و عظمت کا منکر ہو سکے۔

اسلام اور ایمان کے ضابطہ میں مادی تعلقات اور بشری جذبات کی قدر اور رعایت جو کچھ ہے بس اتنی ہے۔ اس کے آگے اسلام کی سرحد ختم اور کفر کی مملکت اور اس کا آئین شروع ہو جاتا ہے جہاں یہی دنیا اور اسی دنیا کی لگاوٹیں ہی سب کچھ ہیں۔ ان حدود میں رہنے والے خدا کے پیدا کیے ہوئے ان تمام فتنوں کے سامنے سر جھکائے ان کی پرستش میں دن رات مشغول رہتے ہیں اور دیدۂ عبرت رکھنے والوں کو دکھاتے رہتے ہیں کہ دنیا کے تعلقات اپنی جائز حد سے گذرنے کے بعد کس طرح انسان کے دشمن بن جاتے ہیں اور اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ

کی شکل کیا ہوتی ہے۔

خدا کی سنت یہی ہے کہ وہ انھیں فتنوں کے ذریعے اپنے فرمانبردار بندوں اور سرکش و نافرمان باغیوں کو الگ کیا کرتا ہے، اور کسی فرد یا جماعت کو اس وقت تک اپنی مقبولیت کا شرف نہیں بخشتا جب تک کہ وہ فتنوں کی اس بھٹی میں تپا کر جانچ نہ لیے جائیں، اور آزمائشوں سے یہ بات کھل نہ جائے کہ کھرا کون ہے جو اپنے اصلی مقصد آفرینش کو یاد رکھتا اور دنیا کے سارے علائق پر اسے ترجیح دیتا ہے، اور کھوٹا کون ہے جو دنیا کے عشق میں سرشار ہو کر اپنے منتہا سے غافل ہو بیٹھا ہے۔ اسی بات کو یوں فرمایا گیا ہے کہ:۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ (عنکبوت۔ ۱)

کیا لوگوں کو گمان ہے کہ وہ صرف اتنا کہنے پر کہ ہم اللہ پر ایمان لائے، چھوڑ دیے جائیں گے اور ان کی آزمائش نہ ہوگی؟

یعنی "فتنہ" اور آزمائش کی راہ سے بہرحال گذرنا ہوگا تاکہ معلوم ہو جائے کہ کون مال و اولاد، اعزہ و اقارب اور گھر بار کے رشتوں کو اپنی فطری حد میں رکھ کر اللہ کے تعلق کو سب پر بالا و برتر رکھتا ہے، اور کون ایسے فریب کار ہیں جو نام تو توحید کا لیتے ہیں لیکن ان کے قلوب انھیں دنیوی رشتوں کی مضبوط گرفت میں جکڑے ہوئے ہیں، اور ضرورت کے وقت اس گرفت سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ (بقرہ۔ ۱۹)

اور ہم تمھیں کسی قدر خوف اور بھوک اور مال اور جان اور پیداوار کی کمی سے ضرور آزمائیں گے اور اے پیغمبر ان مصائب پر صبر کرنے والوں اور ہماری آزمائش میں پورا اترنے والوں کو فلاح کی خوشخبری سنا دو۔

اس آیت اور پہلی آیت (زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّھَوٰتِ) دونوں کو ایک دوسری کی روشنی میں دیکھیے تو صاف نظر آتا ہے کہ جن چیزوں کی محبت انسانی سرشت میں رکھی گئی ہے انہی میں انسان کی اخلاقی طاقت کے لیے آزمائش بھی رکھ دی گئی ہے اور یہی آزمائش وہ فیصلہ کن چیز ہے جس سے خدا پرست اور دنیا پرست ممیز ہوتا ہے۔ سارے مادی علائق، دنیوی رشتے، اور بشری جاذبے اسی امتحان کے لیے پیدا کیے گئے ہیں کہ انسانوں میں سے کون اتنا بودا اور کمزور ہے کہ ان کا

بندہ اور پرستار بن کر خدا کی محبت کو ان کی محبت پر سے قربان کر دیتا ہے، اور کس میں اتنی طاقت ہے کہ ان سب چیزوں کو اپنے لیے اور اپنے آپ کو خدا کے لیے سمجھے اور آزمائش کے وقت ہر ایک چیز کو خدا کی خوشنودی کے لیے قربان کر سکے۔ اسی لیے مومن کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ اس کی جان اور مال یعنی اس کی پوری دنیا خدا کے ہاتھوں بکی ہوئی ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ (توبہ-۱۴) اور اگر کوئی مدعیِ ایمان اس ذوقِ تسلیم و رضا سے آشنا نہیں تو وہ نیکی اور تقوٰی کا مقام رفیع ہرگز نہیں پا سکتا لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران-۱۰) گویا اسلام نام ہی ہے قربانی کا، یعنی جان اور مال کی قربانی کا، مرغوباتِ نفس اور لذاتِ زندگی کی قربانی کا، مودتِ قربیٰ اور حبِ وطن کی قربانی کا اور ان تمام دنیوی تعلقات اور مادی رغائب کی قربانی کا جن کی کشش اور محبت خالقِ کائنات کی طرف سے انسانی سرشت میں ودیعت کی گئی ہے، وہی کشش اور محبت جس کے وجود کا اعتراف آیت زُیِّنَ لِلنَّاسِ الخ میں کیا گیا ہے۔

اب ان ساری تفصیلات کے بعد سوال پیدا ہوگا کہ آخر یہ تمام چیزیں، جن کی قربانی کا نام ہی قرآن کی اصطلاح میں اسلام ہے، کس چیز پر قربان کی جانی چاہئیں؟ بالفاظ دیگر انسان کا وہ "منتہائے حیات" اور "اصل مقصدِ زندگی" کیا ہے جس کے مقابل دنیا کی بڑی سے بڑی متاع محبوب ناقابلِ التفات اور فراموش ہو جانی چاہیے؟ اس کا جواب قرآن یہ دیتا ہے:-

قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ	اے پیغمبر مسلمانوں سے کہہ دو کہ اگر تمھارے باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں
وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ	اور تمھارا خاندان اور تمھارا کمایا ہوا مال، اور تمھاری تجارت
وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْھَا وَتِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ	جس کے مندا پڑ جانے کا تمھیں بڑا اندیشہ رہتا ہے، اور تمھارے دل پسند
کَسَادَھَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَھَا اَحَبَّ اِلَیْکُمْ	مکانات، یہ ساری متاع دنیوی تمھارے نزدیک خدا اور اس کے
مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَجِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِہٖ	رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں

فَتَرَبَّصُوا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِيْنَ (توبہ - ۳)

تو انتظار کرو یہاں تک کہ خدا اپنا حکم اور فیصلہ صادر کرے اور اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

غور فرمائیے، پھر انھیں متاعہائے ارضی کا ذکر ہے جنھیں گذشتہ آیات میں انسان کی مرغوب خاطر ظاہر کیا گیا تھا۔ یہاں بھی ان اشیاء سے انسان کی فطری دلبستگی کا نہ انکار کیا گیا ہے اور نہ اسے مذموم اور مخالفِ ایمان قرار دیا گیا ہے، بلکہ اشارتاً اس کا وجود بطور حقیقتِ مسلّمہ کے تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ مطالبہ یہ کیا گیا ہے کہ عشق اور طلب اور سعی کا اصلی منتہا صرف ذاتِ خداوندی ہے۔ جب تک دنیا کی رغبتیں خدا کے اس حق پر اثر انداز نہیں ہوتیں، انسان ان سے تعلق رکھنے میں حق بجانب ہے، اس پر کوئی گرفت اور الزام نہیں لیکن جب یہ مال و دولت، یہ فرزند و زن، یہ خویش و اقارب، یہ نسل و خاندان، یہ دیار و وطن اور یہ سب سامان زندگی انسان کے لیے قفسِ روح اور زنجیرِ پا بن جائیں اور یہ محبوبِ حقیقی کی طلب و دعوت پر اسے حاضر نہ ہونے دیں تو ان سب چیزوں کی محبت حرام ہو جاتی ہے اور یہ حرام محبت کفر کا سرچشمہ ہے، جس طرح خدا کی طلب پر اس محبت کو قربان کر دینا اسلام کا سرچشمہ ہے۔

خدا کی محبت اور عشق ایک باطنی کیفیت کا نام ہے اور اس کی خارجی تفسیر یا اس کا مظہر عبادت ہے، یعنی دائماً خدا کی خوشنودی کے مطابق عمل کرنا۔ اصل شے کو آپ ایمان سے اور اس کے مظہر کو اسلام سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہی ایمان، انسانی ضابطۂ حیات کی تشکیل میں اساس کی حیثیت رکھتا ہے اور اس اساس پر جو عمارت کھڑی ہوتی ہے، اسی کا نام اسلام ہے۔ گذشتہ آیات میں جس چیز کے لیے دنیا اور اس کے تعلقات کی قربانی کا ذکر ہے وہ یہی "اساس" اور یہی "عمارت" ہے۔ قرآن دنیا کی محبوب سے محبوب چیز کو بھی یہ حق نہیں دیتا کہ وہ اس عمارت کی صحیح تعمیر میں خلل انداز ہو اور اس کی وجہ سے اس میں رخنے پڑیں۔ وہ اسے تو تسلیم کرتا ہے کہ دنیا اور اس کی ساری متاع سے انسان تعلق رکھے اور اس سے پوری طرح لطف اندوز ہو، اور تسلیم کیا معنی وہ تو اس پر زور دیتا ہے مگر ساتھ ہی اس کا یہ بھی مطالبہ ہے

کہ جب کبھی ایمان اور اسلام کے مصالح سے اس دنیا کے کسی بڑے سے بڑے تعلق کے مصالح متصادم ہوں تو انسان کو اس کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ ایسے تعلق کو نہایت صبر و سکون کے ساتھ توڑ دے خواہ وہ موجودہ تہذیب کا "صنمِ اکبر" ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ یہ دنیا انسان کے برتنے کے لیے بنائی گئی ہے نہ کہ پوجنے کے لیے۔ خادم بنائی گئی ہے نہ کہ آقا۔ تابع اور مسخر بنائی گئی ہے نہ کہ الٰہ اور معبود۔ الدنیا خلقت لکم وانتم خلقتم للاخرۃ۔

مادّی تعلقات اور بشری جذبات کے متعلق قرآن کا اجمالی طور پر یہی اصولی نظریہ ہے۔ آئندہ ہم اسی اصل کی روشنی میں مخصوص طور پر وطنیت کے متعلق اسلام کے نقطۂ نظر کی وضاحت کریں گے۔

(باقی)

تنزیل و تاویل

امثال القرآن

(۲)

از جناب مولوی محمد ایوب صاحب جیراجپوری

(۶) کفار کے اعمال کا، اور ان امیدوں کا جو انھوں نے اپنے اعمال کے نتیجہ سے وابستہ کر رکھی ہیں، کیا حشر ہوگا؟ قرآن ایک تمثیل کے پیرایہ میں اس کی توضیح یوں کرتا ہے :-

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا وَوَجَدَ اللَّهَ عِندَهُ فَوَفَّاهُ حِسَابَهُ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ سَحَابٌ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا وَمَن لَّمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَمَا لَهُ مِن نُّورٍ (نور - ۵)

اور کافروں کے اعمال کی حقیقت چٹیل میدان کی اس چمکتی ہوئی ریت کی سی ہے جسے پیاسا دور سے دیکھ کر پانی خیال کرتا ہے یہاں تک کہ جب اس کے قریب آیا تو کچھ نہ پایا۔ البتہ اس نے اللہ کو وہاں موجود پایا جس نے اس کا حساب چکا دیا اور اللہ پل بھر میں حساب لے لینے والا ہے۔ یا ان کے اعمال کی مثال ان تہ بہ تہ تاریکیوں کی سی ہے جو ایک ایسے اتھاہ سمندر میں ہیں جسے موج نے ڈھانک رکھا ہو، پھر اس موج کے اوپر بھی موج ہو اور اس کے اوپر بھی بادل چھایا ہو۔ غرض ایک کے اوپر ایک کئی تاریکیاں جمع ہیں کہ اگر کوئی آدمی اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی نہ دیکھ پائے۔ اور جسے اللہ ہی روشنی (ہدایت) نہ دے

اسے کہیں سے بھی روشنی نہیں مل سکتی۔

اس جگہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے بارے میں دو مثلیں بیان فرمائی ہیں، ایک دور سے چمکتی ہوئی ریت کی۔ دوسری تہ بہ تہ تاریکیوں کی۔ اس لیے کہ حق و ہدایت سے اعراض کرنے والے دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں:

ایک تو وہ لوگ ہیں جنھیں اپنے اوہام و خرافات کی بابت یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ بے بنیاد نہیں ہیں بلکہ کوئی نہ کوئی بنیاد رکھتے ہیں لیکن جب حقیقت بے نقاب ہوتی ہے تو ان کے گمان کی اصلیت آشکارا ہو جاتی ہے ور خیالات و اوہام کا تار پود بکھر جاتا ہے۔ جاہل بدعتیوں اور ہوا پرستوں کا یہی حال ہو کہ یہ لوگ اپنے اہوا و آرا کو علم و بصیرت اور رشد و ہدایت سمجھے رہتے ہیں، لیکن جب اصل حقائق ان کے سامنے آتے ہیں اس وقت ان پر ان کے ظن بے بنیاد کا راز کھلتا ہے اور واضح ہوتا ہے کہ ان کے عقائد اور ان کے اعمال کی یہ عمارت جو ان بے اصل عقائد کی بنیاد پر کھڑی ہے، ایسی ہی ہے جیسے چٹیل میدان کی چمکتی ہوئی ریت، جو دور سے دیکھنے والوں کی نگاہوں میں پانی نظر آتی ہے اور حقیقت کچھ نہیں ہوتی۔ یہی کیفیت اور یہی انجام ہے اُن اعمال کا جو نہ اللہ کے لیے کیے گئے ہیں نہ احکام الٰہی کے اتباع میں، ان اعمال کو صاحب عمل نجات اور سود و بہبود کا ذریعہ سمجھتا ہے حالانکہ اس غلط توقع کا انجام حسرت کے سوا کچھ نہیں۔ یہی وہ اعمال ہیں جن کی بابت حتمی وعدہ بلکہ فیصلہ ہے کہ وَقَدِمْنَا إِلَىٰ مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَاهُ هَبَاءً مَّنثُورًا۔

تشبیہ کی بلاغت پر غور کرو! اللہ تعالیٰ نے سراب کے ساتھ "بالقیعۃ" کی قید بھی لگائی ہے۔ قیعہ اس چٹیل میدان کو کہتے ہیں جہاں حیوانی اور نباتی وجود کا نام و نشان تک نہ ہو، یعنی محل سراب اس سنسان صحرا کو بتایا ہے جو بالکل بے آب و گیاہ اور ہر غیر جمادی وجود سے خالی ہو، اور خود سراب ایک ایسی شئے ہے جو بالکل بے حقیقت و بے اصل ہے۔ اب ان کے اعمال اور قلوب کو، جہاں ایمان و ہدایت کی کسی کرن کا گذر ممکن نہیں، سراب اور اس کے مذکورہ بالا موقع و محل سے مطابقت دو کیسی چول سے چول بیٹھ جاتی ہے جس طرح اس محل سراب میں کسی چیز کا وجود نہیں اسی طرح ان کے دلوں میں آفتاب ہدایت کی کرنوں کا گذر نہیں، اور جس طرح

سراب کی کوئی حقیقت نہیں اسی طرح ان کے اعمال بھی فریب محض ہیں جن سے انھیں توقعات تو بہت ہیں مگر وقت پر ان کے لیے سراب کی طرح معدوم الحقیقت ثابت ہوں گے۔

پھر "یحسبہ الظمآن ماءً" کی قید مزید پر غور کرو۔ "ظمآن" اس شخص کو کہتے ہیں جو سخت پیاسا ہو۔ ایسا شخص پیاس کی شدت سے بیتاب ہو کر چمکتی ہوئی ریت کو پانی سمجھ کر پاس آتا ہے اور وہاں کچھ نہیں پاتا بلکہ تشنگی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کفار کا یہی حال ہوگا ان کے اعمال غیر اللہ کے لیے ہونے اور اطاعت رسول پر مبنی نہ ہونے کی وجہ سے بالکل سراب کے مشابہ ہیں۔ جس طرح پیاسا آدمی چمکتی ہوئی ریت کی طرف، پانی سمجھ کر لپکتا ہے اور ناگہانی یاس و حسرت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا اسی طرح میدان حشر میں کفار نہایت احتیاج کی حالت میں، بڑی امیدوں کے ساتھ اپنے اعمال کی طرف بڑھیں گے لیکن اعمال کا کہیں نام و نشان نہ ہوگا البتہ خدا موجود ملے گا اور ان کا حساب چکا دے گا۔ صحیح بخاری میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ باری تعالیٰ کی (قیامت کے دن) تجلی کا ذکر کرتے ہوئے آنحضرت صلعم نے فرمایا:۔

"پھر جہنم لا کر پیش کی جائے گی جس کی شکل بالکل سراب کی سی ہوگی۔ اور یہود سے سوال ہوگا کہ تم نے کس کی عبادت کی؟ کہیں گے خدا کے بیٹے عزیر کی، کہا جائے گا تم جھوٹے ہو، خدا کے نہ بیوی تھی نہ بیٹا۔ اچھا اب کیا چاہتے ہو؟ کہیں گے، پانی پینا۔ کہا جائے گا جاؤ پیو۔ چنانچہ وہ جہنم کی طرف ٹوٹ پڑیں گے۔ پھر نصاریٰ سے خطاب ہوگا، تم نے کس کو پوجا؟ جواب دیں گے مسیح خدا کے بیٹے کو۔ کہا جائے گا تم جھوٹ بکتے ہو، خدا بیوی، بیٹے والا کب تھا۔ کہو اب کیا چاہتے ہو؟ کہیں گے سیراب ہونا۔ حکم ہوگا جاؤ پیو۔ سو وہ بھی دوزخ میں گرے جا رہے ہوں گے الخ"

ہر باطل پرست کا یہی حال ہوگا یعنی باطل اس کے ساتھ اس وقت غداری کرے گا جبکہ اسے مدد کی سخت ضرورت ہوگی کیونکہ باطل کی کوئی اصلیت نہیں ہوتی، اس کا مسمیٰ بھی ویسا ہی باطل ہوتا ہے جیسا کہ اس کا اسم۔ پس جب اعتقاد میں حق کی مطابقت نہ پائی جائے گی تو اس سے جو چیز متعلق ہوگی وہ بھی باطل ہوگی۔ اسی طرح عمل کی غرض و غایت اگر باطل ہو

مثلاً عمل خالصۃً لوجہ اللہ نہ ہو یا احکام الٰہی پر مبنی نہ ہو، تو وہ باطل ہوگا اور عمل کرنے والا اپنی توقع کے خلاف اس کی بدولت مضرت سے دوچار ہوگا۔ نیز اس کے اعتقاد و عمل کی طرف سے غفلت نہ ہوگی کہ مالہ وما علیہ کا فرق و امتیاز کئے بغیر فیصلہ ہو جائے بلکہ اسے نفع سے محروم رہنا اور مضرت و عذاب کا مزہ چکھنا ہوگا۔ وَوَجَدَ اللّٰہَ عِنْدَہٗ فَوَفّٰىہُ حِسَابَہٗ ۗ وَاللّٰہُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ۔

یہ اس گم کردہ راہ جماعت کی تصویر و تمثیل تھی جس نے غلط گمان کی وجہ سے اپنے آپ کو ہدایت اور راہ راست پر سمجھا تھا۔ اب منکرین حق کی دوسری قسم کو لو جس کے حالات کی تشبیہ ظلمات بحر سے دی گئی ہے۔ یہ ان لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو حق اور رشد و ہدایت کو جان پہچان کر ترک کر دیتے اور باطل ہی کی تاریکیوں کو اپنے لیے پسند کرتے ہیں۔ ان لوگوں پر ایک دو نہیں کئی طرح کی تاریکیاں چھا جاتی ہیں۔ ایک طرف سے فطرت کی ظلمت کا شکار ہوتے ہیں۔ دوسری طرف روح کی ظلمت کا۔ تیسری سمت سے جہل کی تاریکی مسلط ہوتی ہے (کیونکہ وہ اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کرتے، انجام کار جہل کا زنگ ان پر بیٹھ جاتا ہے) اور چوتھی طرف اتباع ہوا کی۔ ان تہ بہ تہ ظلمتوں میں گھر جانے کے بعد ان کا حال بالکل اس شخص کے مشابہ ہو جاتا ہے جو ایک ایسے دریائے ناپید اکنار میں جا پہنچا ہو جس میں لہروں پر لہریں اٹھ رہی ہوں اور ساتھ ہی اوپر سے سیاہ بادلوں کی تاریکی بھی اس پر چھائی ہوئی ہو۔ یعنی اس پر تین طرح کی تاریکیاں بیک وقت چھائی ہوئی ہوں، دریا کی تاریکی، موجوں کی تاریکی، اور بادل کی تاریکی۔ غور کرو، انھیں تاریکیوں کے مشابہ کفار کے قلوب کی تاریکیاں بھی ہیں۔ فطرت کی تاریکی، روح کی تاریکی، اور دماغ کی تاریکی۔

سراب (جسے دور سے پانی یعنی مادۂ حیات سمجھا گیا) اور ظلمات (جو نور کی ضد ہے)، کی یہ دونوں مثلیں اُن دونوں (ناری و مائی) مثلوں کے مشابہ ہیں جو منافقین اور مومنین کے بارے میں اوپر بیان کی جا چکی ہیں اور جن میں مومنین کا حصہ "زندگی" اور "نور" دکھایا گیا ہے اور منافقین کا حصہ ان کے برعکس ظلمت اور ذلت کی ہولناکی بتائی گئی ہے۔ یہی حالت منکرین و منافقین کی زیر بحث مثلوں میں بھی بیان ہوئی ہے کہ پانی کی تلاش میں انھیں سراب ملا جو دھوکے سے پانی نظر آ رہا تھا اور جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی، اسی طرح نور کے بجائے ظلمت،

جو ایک طرح کی روحانی موت ہے، ان کے مقدر میں نکلی۔

ہو سکتا ہے کہ اس تمثیل میں بحیثیت مجموعی کفار کی تمام جماعتوں کی حالت کی طرف اشارہ ہو اور ان سب کی اس مشترک بدبختی کا اظہار مقصود ہو کہ انھوں نے وحی الٰہی کی طرف اعتنا اور توجہ نہ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "روح حیات" اور "نور" سے محروم ہو گئے (کیونکہ قرآن وحی کو روح اور نور سے تعبیر کرتا ہے) اس صورت میں یہ دونوں مثلیں ایک ہی موصوف کی دو صفتیں ہوں گی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کفار کے مختلف گروہوں کا الگ الگ حال بیان کرنا مقصود ہو۔ اس صورت میں پہلی مثل ان لوگوں سے متعلق ہو گی جنھوں نے علم و بصیرت کی روشنی کے بجائے محض ظن اور جہل اور اپنے اسلاف کے حسن ظن پر اپنے اعمال کی بنا رکھی، اور آخر دم تک یہ سمجھتے رہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں نہایت ہی بہتر کر رہے ہیں، یعنی گمراہی کے باوجود انھیں اپنے حسن عمل کا پورا یقین تھا۔ اور دوسری مثل اس جماعت کے بارے میں ہو گی جس نے ہدایت کو چھوڑ کر ضلالت اختیار کی اور حق و صداقت پر باطل کو ترجیح دی اور حق اور ہدایت کا چہرہ دیکھنے کے بعد اندھے بنے یعنی حق کو پہچان کر انکار کی شقاوت میں مبتلا ہوئے دونوں گروہوں کا فرق ظاہر ہے۔ پہلا گروہ ضالین کا ہے اور دوسرا مغضوب علیہم کا۔ اور ان دونوں گروہوں کا حال اس مُنعَم علیہ گروہ کے حال سے بالکل مختلف بلکہ مقابل ہے جس کا ذکر آیۃ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ میں کیا گیا ہے۔ اس پورے سلسلے کو سامنے رکھو تو معلوم ہو گا کہ ان آیات میں تینوں جماعتوں کے اوصاف بیان کیے گئے ہیں، ایک تو وہ گروہ ہے جس کے لیے نور کی مثل بیان کی گئی ہے۔ دوسری جماعت ضالین کی ہے جو ضلالت کی تاریکیوں میں ٹھوکر کھاتی رہی، جس کے لیے سراب کی مثال دی گئی ہے۔ اور تیسری جماعت مغضوب علیہم کی ہے جس پر خدا کی پھٹکار اور غضب کی لعنت پڑی "اَوْ کَظُلُمٰتٍ" میں انھیں کی تصویر کھینچی گئی ہے مختصر لفظوں میں ان تینوں گروہوں کا نام، اہلِ نور، اہلِ سراب، اور اہل ظلمات رکھا جا سکتا ہے۔ پس ان دونوں مثالوں میں پہلی مثل ارباب عمل باطل کی ہے جنھوں نے عمل باطل کا (نفع اور فائدہ سے بالکل خالی) ذخیرہ جمع کیا۔ اور دوسری اُن اصحاب علم باطل کی ہے جنھوں نے علم حق کو چھوڑ کر غلط اعتقاد اور فاسد اور غیر نافع علم اختیار کیا۔

اور یہ دونوں چیزیں، باطل عمل اور باطل علم، دینِ حق سے فطری تضاد رکھتی ہیں۔ اسی وجہ اللہ تعالیٰ نے فریقِ ثانی کے شکوک و شبہات اور علوم فاسدہ سے گھرے ہوئے دلوں کی تشبیہ اس دریا کی متلاطم حالت سے دی ہے جس میں موجیں اُٹھ رہی ہوں اور تہ بتہ بادلوں کی تاریکی بھی اوپر سے مسلط ہو کیونکہ بعینہٖ یہی تصویر ان تاریک اور مضطرب دلوں کی ہیئت نفسی کی ہوتی ہے جن کے اندر شکوک و شبہات کے دریا موجزن ہوتے ہیں، اور جن پر دانستہ گمراہی، ہوا پرستی اور باطل کا سیاہ ابر بھی محیط ہوتا ہے۔ اگر علم و بصیرت کے ساتھ ان دونوں مثلوں پر اور کفار کی ہیئتِ نفسانیہ سے ان کے کمال تطابق پر غور کیا جائے تو فطرتِ انسانی قرآن کی عظمت و جلالت کے سامنے سرِ اعتراف جھکا دے گی اور اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ اسی ذاتِ واحد کا کلام ہو سکتا ہے جو ہر طرح کی ستائشوں اور تعریفوں کی تنہا مستحق اور تمام حِکَم و اسرارِ فطرت کی تنہا رازداں ہے۔

(۷) کفر نا ممکن العلاج مریضوں کی حالت کی مثال:-

اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا۔ (فرقان - ۴۴)	یا تم خیال کرتے ہو کہ ان میں اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں؟ نہیں، یہ تو بالکل چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی گئے گذرے۔

اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر نسلِ انسانی کے کج فطرت طبقہ کی تشبیہ چوپایوں سے دی ہے۔ وجہ مشابہت ہدایت کا عدم قبول ہے جس میں دونوں گروہ یکساں طور پر شریک ہیں۔ یہ لوگ باطنی تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں اور فہم و ادراک کی صلاحیت فنا کر کے جہل کے قالب میں ایسے ڈھل گئے ہیں کہ گویا حیوانات کی طرح انھیں سرے سے عقل و ہوش اور بصیرتِ قلب کی استعداد حاصل ہی نہیں ہوئی۔ پھر اس تشبیہ کے بعد قرآن نے ان لوگوں کو جانوروں سے بھی زیادہ جادہ فراموش اور شاہراہِ ہدایت سے دور بتایا ہے، کیونکہ بہائم و انعام اگرچہ ایک بے عقل و خرد مخلوق ہیں لیکن پھر بھی چرواہے کی رہنمائی کے ذریعہ صحیح راہ انھیں مل بھی جاتی ہے، جسے وہ اختیار کرنے میں پس و پیش نہیں کرتے اور نہ زیادہ تردّد میں بائیں کترانے کی کوشش کرتے

ہیں لیکن حضرت انسان کو دیکھو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ان کو حق و معرفت کی تلقین کرتے، ہدایت کی راہ سمجھاتے اور نجات کی طرف دعوت دیتے ہیں تو ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی اور اس دعوت کو قبول کرنے کے بجائے الٹے اس کے دشمن بن جاتے ہیں، اور اپنے نفع نقصان تک کی تمیز روا نہیں رکھتے کہ جو چیز ان کی نوع (انسانیت) کے لیے مفید ہو اسے اختیار کرلیں اور جو چیز اس کے لیے مہلک ہو اسے ترک کردیں۔ لیکن حیوان پھر بھی بایں ہمہ حیوانیت اپنے بھلے برے کی تمیز کرتا ہے، مضر نباتات اور مہلک پودوں کے کھانے اور خطرناک راستوں پر چلنے سے پوری طرح اجتناب کرتا ہے، حالانکہ خداوند عالم نے اس کو قلب ایسا دیا ہے جس میں فہم و بصیرت کی روشنی مفقود ہے اور زبان ایسی دی ہے کہ نطق و گویائی سے قطعاً محروم۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو ان تمام نعمتوں سے سرفراز فرمایا ہے جو ان کے لیے ہر قدم پر دلیل راہ بن سکتی ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اُن سے فائدہ اٹھانے اور ہدایت و معرفت کی سعادت حاصل کرنے سے محروم ہی رہے، اور عقل کی روشنی، قلب کی بصیرت، زبان کی گویائی، کان کی سماعت اور آنکھ کی بصارت رکھتے ہوئے بھی انھوں نے ان تمام آلاتِ تمیز سے حق و باطل کی راہیں متعین کرنے اور کھرے کھوٹے کو پہچان لینے میں کام نہ لیا۔ پھر وہ حیوانات سے بھی زیادہ گمراہ اور "اضل" کیوں نہ ہوں کیونکہ جو ہاتھوں میں چراغ رکھتا ہو اور اس کے باوجود گڑھے میں جا گرے وہ اس شخص کی بہ نسبت بہت زیادہ قابلِ ملامت ہے جو بغیر چراغ کے ٹھوکر کھائے۔

(۸) شرک کی نامعقولیت :-

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْمَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ - (روم - ۴)

اللہ تمھارے سامنے خود تمھارے اپنے ہی حال سے ایک مثال بیان کرتا ہے۔ جن غلاموں کے تم مالک ہو کیا ان میں سے کوئی بھی اس روزی میں، جو ہم نے تم کو دے رکھی ہے، تمھارا شریک ہے کہ تم اور وہ اس میں برابر کا حق رکھتے ہو، اور ان سے بھی ویسا ہی اندیشہ رکھتے ہو جیسا اپنے (جیسے آزاد حق تصرف رکھنے والوں) سے؟ ایسا ہی

ہم سمجھنے والوں کے لیے کھول کر نشانیاں بیان کرتے ہیں۔

آیتِ کریمہ میں جس دلیل سے اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے بے بنیاد مسلک کے خلاف استدلال کیا ہے اسے اصطلاح میں دلیل قیاس کہا جاتا ہے۔ استفہاماً ان کے غلاموں کو ان کا شریک و سہیم قرار دے کر ان کے خلاف ایسی حجت قائم کی ہے جس کی صحت کے وہ کلی طور پر ایسے معترف ہیں کہ ان کے دماغ میں کبھی اس کی غلطی کا وہم بھی نہیں گذرتا۔ اور یہ دلیل وحجت کا بہترین و بلیغ ترین اسلوب ہے کہ مخالف پر خود اسی کے مسلمات اور بدیہی کلیات سے حجت قائم کی جائے۔ اللہ تعالیٰ ان نادان انسانوں سے خطاب کر کے فرماتا ہے کہ تمہارے یہ غلام اور لونڈیاں جو تمہارے دستِ تصرف میں ہیں کیا یہ تمہارے مال ومتاع میں شریک ہیں؟ کیا اپنے ان ممالیک کے متعلق تم یہ تصور کر سکتے ہو کہ تمہاری جائداد میں یہ مساویانہ حصہ داری رکھتے ہیں؟ اور اس تصور کے تحت تمہارے دلوں میں کبھی یہ خوف پیدا ہوتا ہے کہ کبھی وہ تمہارے مال ومتاع میں سے اپنا حصہ بٹا لیں گے یا اپنے حصے سے زائد تمہارا حق بھی مار لیں گے جس طرح کہ ایک شریک دوسرے شریک سے عموماً خوف وبے اطمینانی محسوس کیا کرتا ہے؟ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے "تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ" کی تاویل یہ فرمائی ہے کہ کیا تم کو ان غلاموں سے یہ اندیشہ اور خوف ہے کہ وہ تمہارے مال واسباب کے وارث ہو جائیں گے جس طرح کہ تم میں سے بعض کو بعض کے ترکہ میں حق وراثت حاصل ہوتا ہے؟ بہر کیف آیت کا مقصد یہ ہے کہ تم میں سے کون ہے جو اس بات پر راضی ہو گا کہ اس کا غلام اس کے سرمایہ اور اہل واولاد میں شریک ہو حتی کہ اس کے برابر حق تصرف رکھے، اور اس حق تصرف کی وجہ سے اسے یہ اندیشہ لاحق ہو کہ کہیں وہ (غلام) موقع پا کر ساری ملکیت پر تنہا نہ قابض ہو جائے، جیسا کہ برابر کے شرکا میں یہ خطرہ ہر دم موجود رہتا ہے؟ اگر تم اس پر راضی نہیں اور نہ کبھی ایسی نامعقول بات تسلیم کرنے کے لیے تیار ہو تو پھر وہی بات میرے لیے کیوں پسند کرتے ہو؟ اور میری مخلوقات کو، جو میرے حلقۂ غلامی میں ہیں، کیونکر میرا ہمسر اور ہم پایہ قرار دیتے ہو؟ اور جبکہ غلام وآقا کی اس مساوات کے تخیل کو تمہاری عقل اور فطرت بداہتہً غلط سمجھتی ہے (حالانکہ تمہارے حق میں اس کا بہت کچھ امکان بھی ہے اس لیے کہ حقیقت کے اعتبار سے تو تمہارے

غلام تمہاری ملک کسی طرح نہیں ہیں، بلکہ دراصل وہ تمہارے برابر کے بھائی ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ نے انہیں تمہارے قبضۂ اقتدار میں دے رکھا ہے، اس لیے محض عرضی طور پر نہ کہ حقیقی طور پر دونوں کے مرتبے جدا گانہ ہو گئے ہیں اور دونوں کو مجازاً "آقا" اور "غلام" کے الگ الگ نام مل گئے ہیں، ورنہ حقیقتاً تم اور تمہارے غلام دونوں کے دونوں ہی کسی اور ہی حقیقی آقا کے غلام اور بندے ہیں) تو میرے حق میں تمہارا ضمیر اسی تخیل کے تسلیم کرنے کی اجازت کیوں کر دیتا ہے حالانکہ وہ تمام کے تمام میرے ہی بندے، میری ہی ملکیت اور میری ہی مخلوق ہیں جن کو تم نے میرا ہم پایہ وہم مرتبہ اور شریک بنا رکھا ہے؟ یہ ہے تفصیل آیات۔ یعنی كَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ کا مطلب۔

(۹) ابطالِ شرک :-

ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوكًا لَّا يَقْدِرُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَمَن رَّزَقْنَاهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَجَهْرًا هَلْ يَسْتَوُونَ الْحَمْدُ لِلَّهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ. وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ أَحَدُهُمَا أَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُوَ كَلٌّ عَلَىٰ مَوْلَاهُ أَيْنَمَا يُوَجِّههُّ لَا يَأْتِ بِخَيْرٍ هَلْ يَسْتَوِي هُوَ وَمَن يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (نحل - ۱۰)

خدا نے ایک مثال بیان فرمائی کہ ایک غلام ہے دوسرے کی ملک جو کسی بات کا اختیار نہیں رکھتا۔ دوسرا شخص ہے (خود مختار) جس کو ہم نے اپنی سرکار سے اچھی روزی دے رکھی ہے تو وہ اس میں سے کچھ چھپا کر اور کچھ کھلے طور پر خرچ کرتا ہے کیا ایسے دو شخص برابر ہو سکتے ہیں؟ (یہ مثال سن کر مشرکین ضرور "نہیں" پکار اٹھیں گے) الحمد للہ کہ اتنا تو سمجھے، لیکن ان میں سے بہتیرے ایسے بھی ہیں جو (اتنا بھی) سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اور خدا نے (ایک دوسری) مثال دو آدمیوں کی بیان فرمائی ان میں کا ایک گونگا (اور کسی کا غلام بھی) ہے جو کچھ نہیں کر سکتا (نیز) وہ اپنے آقا کا بار خاطر بھی ہے کہ جہاں کہیں اس کو بھیجو اس سے کچھ بھی ٹھیک نہیں بن آتا۔ کیا ایسا غلام اور وہ جو عدل کا حکم کرتا ہے اور خود بھی سیدھی راہ پر ہے، برابر ہو سکتے ہیں۔

ان آیات میں قرآن نے دو مثلیں بیان کی ہیں اور دونوں میں استدلال کا وہ طریقہ اختیار کیا ہے جسے اصطلاح میں قیاس عکس کہا جاتا ہے یعنی کسی شے سے علتِ حکم کی نفی کر کے اصل حکم کی نفی کرنا۔ کیونکہ قیاس کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک تو قیاس عام جس میں ثبوت علت کی وجہ سے فرع میں اصل کا حکم لگایا جاتا ہے۔ دوسرا قیاس عکس جس میں

نفی علت کی وجہ سے فرع سے اصل کے حکم کی نفی کی جاتی ہے۔ یہاں اسی طرزِ استدلال سے زیرِ بحث مثلوں میں کام لیا گیا ہے۔

پہلی تمثیل اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت اور شانِ ملوکیت، اور بتوں کے عجز اور بیکسی کی دی ہے۔ اور بت پرستی کی نامعقولیت پر روشنی ڈالی ہے کہ دیکھو اللہ تعالیٰ، عالم کی تمام اشیا، کا مالک کل اور ذرہ ذرہ کا فرمانروا ہے۔ وہ جس طرح چاہتا ہے مخفی طور پر، اور کھلے بندوں شب و روز اپنے بندوں کو انواع و اقسام کی نعمتوں سے نوازتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بے حد وحساب دے ڈالتا ہے۔ اس کا خزانہ رزق اتنا وسیع اور لا محدود ہے کہ شبانہ روز کی پیہم بخششوں اور فیاضیوں کے باوجود بھی کم ہونے والا نہیں۔ اس کے برعکس اصنام و اوثان ایک محکوم اور درماندہ مخلوق ہیں جن کو کسی چیز پر بھی قدرت و اختیار نہیں تو پھر مشرکین کو کیا ہوگیا ہے کہ اس عظیم الشان اور روشن از آفتاب فرق کے باوجود، کہ میں قادر مطلق ہوں اور یہ بت مجبور محض، میں مالک ہوں اور یہ مملوک، وہ کس طرح ان بے بس اور درماندہ مورتوں کو میرا شریک و ہمتا سمجھتے ہیں۔ اور مجھے چھوڑ کر ان کی پرستش کرتے ہیں۔

آیت کی یہ تاویل امام مجاہد وغیرہ نے کی ہے لیکن حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ایک دوسری تاویل بیان فرمائی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی اور معبودانِ باطل کی مثال نہیں دی ہے بلکہ مومن اور کافر کی دی ہے، اور بتایا ہے کہ صالح مومن کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اللہ کی طرف سے بہترین رزق سے نوازا گیا ہے جسے وہ اپنے مصارف میں بھی خرچ کرتا ہے اور دوسروں کی بھی، چھپکر اور برملا، ہر طریقہ سے حاجت روائی کرتا ہے۔ بخلاف اس کے خیر و صلاح سے عاری کافر کی مثال اس بیکس اور زیرِ اقتدار غلام کی سی ہے جو مجبور محض اور بالکل ہی قدرت واختیار سے محروم ہے اور جو ایک حبہ بھی خرچ کرنے پر قادر نہیں۔ کیونکہ اس کے پاس کچھ ہے ہی نہیں۔ اس توضیح اور تفریق کے بعد سوال کرتا ہے کہ کیا کسی صاحبِ عقل کے نزدیک یہ دونوں یکساں اور ہم پلہ ہو سکتے ہیں؟

آیت کی یہ دو تاویلیں کی گئی ہیں لیکن پہلی تاویل زیادہ معنی خیز اور لگتی ہوئی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اصل مقصد یعنی ابطالِ شرک کے لیے یہ زیادہ مؤثر بھی ہے اور واضح بھی۔ اور نظم کلام بھی اسی کا مقتضی ہے، چنانچہ اس سے پہلے آیت وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ

شَيْئًا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ہے جس میں شرک کی بے بنیادی ثابت کی گئی ہے۔ اور اس کے بعد ہی ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ الخ کی تمثیل بیان کی گئی ہے جس سے متبادر یہی ہوتا ہے کہ یہ تمثیل آیت ماسبق کی توضیح ہے۔ ہاں اس مثل سے لازمی طور پر یہ مفہوم بھی خود بخود کھل جاتا ہے کہ توحید پر کامل اعتقاد رکھنے والے مومن کا حال اس شخص کا سا ہے جس کو بارگاہِ خداوندی سے رزق کا بہترین حصہ ملا ہو اور اس کو اس سے فائدہ اٹھانے کا پورا پورا اختیار حاصل ہو، اور کافر مشرک کی مثال اس زیر اقتدار اور مملوک غلام کی سی ہے جس کو کچھ بھی قدرت و اختیار حاصل نہیں لیکن یہ آیت کا اصل معنی نہیں ہے بلکہ بطور اشارۃ النص کے اس سے یہ مفہوم بھی ضمناً نکلتا ہے۔ لہذا حضرت عبد اللہ بن عباسؓ رضی اللہ عنہما کا یہ فرمانا کہ اس مثل میں مومن و کافر کی حالت بیان ہوئی ہے، در اصل اسی حقیقت کا حامل ہے اور ان کے کہنے کا مقصد یہی ہے کہ ابطال شرک کے ساتھ ساتھ مومن و کافر کی واقعی حیثیت بھی اشارۃ اس آیت سے روشنی میں آجاتی ہے۔ یہ مقصد نہیں ہے کہ آیت کا اصلی اور متعین مفہوم ہی یہی ہے۔ اور قرآن کے فہم اور اس کی تفسیر کا یہ بھی ایک عام انداز ہے جس کی تائید چاہو تو قدماء کے اقوال کی طرف مراجعت کرو حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اور دیگر سلفِ صالحینؒ کے اقوال میں تو اس کی بے شمار نظیریں موجود ہیں۔ وہ اکثر آیات میں ان کے اصل معانی کو بیان کرنے کے بجائے ان کے لوازم اور ضمنی احکام پر اشارہ کر کے خاموش ہو جاتے ہیں لیکن عام لوگوں کو گمان ہوتا ہے کہ آیات کی متعین تاویل ان کے نزدیک یہی ہے، اور اس کوتہ نظری کی وجہ سے لوگ اقوالِ سلف کو تفسیر آیات کی حیثیت سے پیش کرنے لگتے ہیں۔

تقریظ و انتقاد

"متحدہ قومیت اور اسلام"

اس عنوان سے جناب مولانا حسین احمد صاحب صدر دارالعلوم دیوبند کا ایک رسالہ حال میں شائع ہوا ہے[1]، اور ہمارے پاس تنقید کے لیے بھیجا گیا ہے۔ ایک نامور عالمِ دین، اور ہندوستان کی سب سے بڑی دینی درسگاہ کے صدر ہونے کی حیثیت سے مصنف کا جو مرتبہ ہے، اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمیں توقع تھی کہ اس رسالہ میں "قومیت" کے اہم اور نہایت پیچیدہ مسئلہ کی تنقیح و تحقیق خالص علمی طریقہ پر کی گئی ہوگی، اور اس باب میں اسلام کا نقطۂ نظر پوری طرح واضح کر دیا گیا ہوگا۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے اس رسالہ کو اپنی توقعات سے اور مصنف کی ذمہ دارانہ حیثیت سے بہت فروتر پایا۔

یہ ایسا زمانہ ہے جس میں جاہلی تصورات نے ہر طرف سے اسلامی حقائق پر زغنہ کر رکھا ہے، اور اسلام اپنے گھر ہی میں غریب ہو رہا ہے۔ خود مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ وہ خالص اسلامی نگاہ سے مسائل کو نہیں دیکھتے، اور کمی علم کی وجہ سے نہیں دیکھ سکتے۔ پھر قومیت کا مسئلہ اتنا اہم ہے کہ اسی کے صاف اور واضح فہم و ادراک پر ایک قوم کی زندگی کا مدار ہوتا ہے۔ اگر کوئی قوم اپنی قومیت کے اساسات ہی کو اجنبی اصول و مبادی میں خلط ملط کر دے تو وہ قوم سرے سے قوم ہی نہیں رہ سکتی۔ ایسے نازک زمانے میں ایسے نازک مسئلے پر قلم اٹھاتے ہوئے مولانا حسین احمد صاحب جیسے شخص کو اپنی ذمہ داری کا پورا احساس ہونا چاہیے تھا اس لیے کہ وہ امانتِ انبیاء کے امین ہیں اور جب اسلامی حقائق جاہلیت کے گرد و غبار میں چھپ رہے ہوں تو یہ انہی جیسے لوگوں کا کام ہے کہ انھیں صاف اور منقح کر کے روشنی میں لائیں۔ ان کو یہ سمجھنا چاہیے تھا کہ اس فتنہ کے دور میں ان کی ذمہ داری عام مسلمانوں کی ذمہ داری

[1] مجلس قاسم المعارف دیوبند سے ۸ میں مل سکتا ہے

سے زیادہ سخت ہے اور اگر مسلمان کسی گمراہی میں مبتلا ہوں تو سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر وہی ماخوذ ہونے والے ہیں۔

لیکن ہمیں پھر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مولانا کا یہ رسالہ اس ذمہ داری کے احساس سے بالکل خالی ہے۔ اس میں مسئلے کی حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے، جن الجھنوں میں یہ مسئلہ اس وقت الجھا ہوا ہے ان کو سلجھانے کے بجائے فاضل مصنف خود انہی میں الجھ گئے ہیں، اور انھوں نے اپنا تمام تر زور صرف اس پر صرف کر دیا ہے کہ "متحدہ قومیت" کو محض لفظی حیثیت سے ایک اسلامی چیز ثابت کر دکھائیں، بلا اس لحاظ کے کہ معنی اور مآل کے اعتبار سے بھی وہ اسلامی ہو یا نہ ہو۔

غیر علمی زاویۂ نظر ایک مصنف کی تصنیف میں سب سے پہلے جس چیز کو تلاش کرنا چاہیے وہ اس کا زاویۂ نظر ہے، اس لیے کہ اپنے موضوع کے ساتھ مصنف کا برتاؤ، اور اس کا صحیح یا غلط نتائج پر پہنچنا، تمام تر اس کے زاویۂ نظر ہی پر منحصر ہوتا ہے۔ سیدھا اور صحیح زاویۂ نظر یہ ہے کہ آدمی محض امر حق کا طالب ہو اور مسئلے کو، جیسا کہ وہ فطرۃً وحقیقۃً ہے، اس کے اصلی رنگ میں دیکھے، اور حقیقت کا یہ مشاہدہ جس نتیجہ پر بھی پہنچاتا ہو اس پر پہنچ جائے بلا اس لحاظ کے کہ وہ کس کے خلاف پڑتا ہے اور کس کے موافق۔ یہ بحث و تحقیق کا فطری اور علمی زاویۂ نظر ہے اور اسلامی زاویۂ نظر بھی اس کے سوا کوئی نہیں کہ اسلام کی روح ہی الحب فی اللہ والبغض فی اللہ ہے۔ اس سیدھے زاویۂ نظر کے علاوہ بہت سے ٹیڑھے ترچھے زاویۂ نظر بھی ہیں، مثلاً ایک یہ کہ آپ کسی کی محبت میں مبتلا ہیں، اس لیے صرف اسی نتیجہ کی طرف جانا چاہتے ہیں جو اس کے موافق ہو، اور دوسرا یہ کہ آپ کو کسی سے بغض و عداوت ہے اس لیے آپ کو تلاش صرف انہی چیزوں کی ہے جو آپ کے مبغوض کی مخالف ہوں۔ اس قسم کے ٹیڑھے زاویے جتنے بھی ہیں سب کے سب خلاف حق ہیں۔ انھیں اختیار کر کے کوئی بحث کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتی۔ کسی عالم اور متقی انسان کے لیے زیبا نہیں کہ ایسے کسی زاویہ سے کسی مسئلے پر نگاہ ڈالے اس لیے کہ یہ "اسلامی" نہیں بلکہ "جاہلی" زاویۂ نظر ہے۔

اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ مولانا نے اس رسالہ میں کونسا زاویۂ نظر اختیار فرمایا ہے۔ اپنی بحث کے آغاز میں وہ فرماتے ہیں:۔

"ضروری معلوم ہوا کہ . . . . ان غلطیوں کا ازالہ کردوں جو اس قسم کی قومیتِ متحدہ سے ممانعت اور

اس کو خلافِ دیانت قرار دینے کے متعلق شائع ہوئی ہیں یا شائع کی جا رہی ہیں۔ کانگریس ۱۸۸۵ء سے اہل ہندوستان سے بنا بر وطنیت اس اتحاد قومی کا مطالبہ کرتی ہوئی بیش از بیش جد و جہد عمل میں لا رہی ہے۔ اور اس کی مقابل و مخالف قوتیں اس کے غیر قابل قبول ہونے بلکہ ناجائز اور حرام ہونے کی انتہائی کوششیں عمل میں لا رہی ہیں۔ یقیناً برٹش شہنشاہیت کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی خطرناک چیز نہیں ہے۔ یہ چیز میدان میں آج سے نہیں بلکہ تقریباً ۱۸۸۱ء یا اس سے پہلے سے لائی گئی ہے اور مختلف عنوانوں سے اس کی وحی ہندوستانیوں کے دل و دماغ پر عمل میں لائی جا رہی ہے"۔ (صفحہ ۵-۶)

پھر چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں:۔

"اگرچہ بہت سے ان لوگوں سے جن کو برطانیہ سے گہرا تعلق ہے یا جن کے دماغ اور قلب برطانوی مدبرین کے سحر سے ماؤف ہو چکے ہیں امید نہیں ہے کہ وہ اس کو قبول کریں گے"۔

اسی سلسلہ میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کے متعلق فرماتے ہیں کہ ان کی ہستی کوئی معمولی ہستی نہ تھی۔ وہ ایسے تھے اور ایسے تھے مگر "باوجود کمالات گوناگوں ساحرین برطانیہ کے سحر میں مبتلا ہو گئے تھے"۔

پھر ایک طویل بحث کے بعد اپنے زاویہ نظر کا صاف صاف اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"ہندوستانیوں کا وطنیت کی بنا پر متحدہ قومیت بنا لینا انگلستان کے لیے جس قدر خطرناک ہے وہ ہماری اس شہادت سے ظاہر ہے جو کہ ہم نے پروفیسر سیلے کے مقالہ سے نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جذبہ ضعیف سا ضعیف بھی اگر ہندوستانیوں میں پیدا ہو جائے تو اگرچہ ان میں انگریزوں کے نکالنے کی طاقت موجود بھی نہ ہو مگر فقط اس وجہ سے کہ ان میں یہ خیال جاگزیں ہو جائے گا کہ اجنبی قوم کے ساتھ ان کے لیے اشتراک عمل شرمناک امر ہے، انگریزی شہنشاہیت کا خاتمہ ہو جائے گا"۔ (صفحہ ۳۸)

آگے چل کر ایک ایسی حیرت انگیز رائے کا اظہار فرماتے ہیں جسے پڑھ کر آدمی ششدر رہ جاتا ہے کہ کیا یہ کسی متقی عالم کی تحریر ہو سکتی ہے:۔

"اگر وطنیت ایسی ہی ملعون اور بدترین چیز ہے تو چونکہ یورپ نے اس کو استعمال کر کے اسلامی بادشاہوں کی عثمانی خلافت کی جڑ کھودی ہے، مسلمانوں کو چاہیے تھا کہ اسی ملعون ہتھیار کو برطانیہ کی جڑ کھودنے کے لیے استعمال کرتے۔" (صفحہ ۳۸)

اسی بحث کے دوران میں مولانا پہلے تو اس امر کا اعتراف فرماتے ہیں کہ پچھلی دو صدیوں میں اسلامی سلطنتوں کو جس قدر بھی نقصان پہنچا ہے اسی وجہ سے پہنچا ہے کہ یورپ نے اسلامی وحدت کے خلاف سخت پروپیگنڈا کیا، "اور مسلمانوں میں نسلی، وطنی، لسانی امتیاز و افتراق پیدا کر دیا" اور "ان میں یہ اسپرٹ پیدا کی کہ جہاد مذہبی و روحانی نہ ہو بلکہ نسلوں اور اوطان کے لیے کیا جائے اور مذہبیت کی اسپرٹ درمیان سے نکال دی جائے" (صفحہ ۳۵-۳۶) لیکن امر حق کے اس قدر قریب پہنچ جانے کے بعد پھر وہی برطانیہ کا ہوّا مولانا کے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ:-

"افسوس مسلمانوں میں اس وقت کوئی شخص مسلمانوں کی متحدہ قومیت اور ان اوطنیت و نسل و لسان وغیرہ کا واعظ کھڑا نہ ہوا اور نہ یورپ کے اخباروں رسائل، لکچراروں کی بے حد و بے شمار آندھیوں کا مقابلہ کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پان اسلام ازم ایک قصہ پارینہ ہو کر فنا کے گھاٹ اتر گیا اور ممالک اسلامیہ یورپین اقوام کے لقمۂ تر بن کر رہ گئے۔ اب جبکہ مسلمانوں کو افریقہ، یورپ، ایشیا وغیرہ میں پارہ پارہ کر کے فنا کی گود میں ڈال دیا گیا ہے تو ہم کو کہا جاتا ہے کہ اسلام صرف ملّی اتحاد کی تعلیم دیتا ہے، وہ کسی غیر مسلم جماعت سے متحد نہیں ہو سکتا اور نہ کسی غیر مسلم قوم کے ساتھ متحدہ قومیت بنا سکتا ہے۔" (صفحہ ۳۶-۳۷)

یہ عبارات جنھیں اوپر لفظ بلفظ نقل کیا گیا ہے مولانا کے زاویۂ نظر اور ان کے اندازِ فکر کو بالکل بے نقاب کر دیتی ہیں۔ ان سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ مولانا کی نگاہ میں حق اور باطل کا معیار صرف برطانیہ بن کر رہ گیا ہے۔ حق وہ ہے جو برطانیہ کے خلاف ہو اور باطل ہر وہ چیز ہے جس کے متعلق انہیں وہم ہو جائے کہ وہ برطانیہ کی اغراض کے لیے مفید ہے۔ وہ مسئلہ کو نہ تو علمی زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں کہ حقائق اپنے اصلی رنگ میں انھیں نظر آ سکیں، نہ وہ مسلمانوں کی خیر خواہی کے زاویۂ نظر سے اس پر نگاہ ڈالتے ہیں کہ جو کچھ مسلمانوں کے لیے زہر ہے وہ انھیں زہر دکھائی

دے سکے۔ ان دونوں زاویوں کے بجائے ان پر فقط برطانیہ کی عداوت کا زاویہ نظر مستولی ہوگیا ہے جس کی وجہ سے ہر وہ چیز ان کو تریاق نظر آتی ہے جس کے متعلق کسی طرح ان کو معلوم ہو جائے کہ وہ برطانیہ کے لیے زہر ہے۔ اب اگر کوئی شخص اسی چیز کو مسلمانوں کے لیے زہر سمجھتا ہو اور اس بنا پر اس کی مخالفت کرے تو وہ ان کے نزدیک برطانیہ پرست کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ ان کو مسلمانوں کی زندگی سے اتنی دلچسپی نہیں جتنی برطانیہ کی موت سے ہے اور جب یہ بات ان کے دل میں بیٹھ چکی ہے کہ "متحدہ قومیت" برطانیہ کے لیے مہلک ہے تو جو شخص اس کی مخالفت کرتا ہے وہ "برطانیہ پرست" کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا ہے!۔۔۔۔۔ خیریت یہ ہوگئی کہ کسی نے مولانا کو برطانیہ کی ہلاکت کا ایک دوسرا نسخہ نہ بتا دیا جو متحدہ قومیت سے بھی زیادہ کارگر ہے، یعنی یہ کہ ہندوستان کی ۳۵ کروڑ آبادی یک بارگی خودکشی کرے جس سے برطانوی سلطنت آن کی آن میں ختم کی جا سکتی ہے۔ یہ تیر بہدف تدبیر اگر مولانا کے دل میں بیٹھ جاتی تو وہ بے تکلف فرماتے کہ جو شخص ہندستان کے باشندوں کو خودکشی سے روکتا ہے وہ برطانیہ پرست ہے۔ خودکشی اگرچہ "ملعون" اور "بدترین فعل" سہی، مگر جب کہ اس سے برطانیہ کی جڑ کھودی جا سکتی ہے تو فرض ہو جاتا ہے کہ اس فعلِ قبیح کا ارتکاب کیا جائے!۔۔۔۔ ایسی ہی باتوں سے یہ راز سمجھ میں آتا ہے کہ دین میں الحب فی اللہ والبغض فی اللہ کو معیارِ حق کیوں قرار دیا گیا ہے۔ اگر خدا کا واسطہ درمیان سے ہٹ جائے اور بجائے خود کوئی شے محبوب یا مبغوض بن جائے تو عصبیت جاہلیہ کی سرحد شروع ہو جاتی ہے جس میں وہ تمام ذرائع و وسائل جائز کر لیے جاتے ہیں جن سے انسان کے جذبات محبت و عداوت کی تشفی ہو سکے، قطع نظر اس کے کہ وہ قانون الٰہی کے مطابق ہوں یا اس کے خلاف۔ اسی لیے کہنے والے نے کہا کہ ذاتی عداوت تو شیطان سے بھی نہ ہونی چاہیے۔ اس میں بھی خدا کا واسطہ بیچ میں رہنا ضروری ہے ورنہ وہ خود ایک قانون بن جائے گی اور تم شیطان کی دشمنی میں خدا کے حدود توڑ دو گے، یعنی اپنے دشمن شیطان ہی کا کام کرو گے۔

اثبات مدعا کے لیے حقائق سے چشم پوشی

اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ مولانا اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے تاریخ کے مشہور اور بیّن واقعات کو بھی صاف نظر انداز کر جاتے ہیں۔ یورپ جب مسلمانوں میں نسلی، وطنی اور لسانی قومیتوں کی تبلیغ کر رہا تھا تو کیا مسلمانوں میں کوئی اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کھڑا نہیں ہوا؟ کیا ٹیپو سلطان، جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ،

مصطفیٰ کامل مصری، امیر شکیب ارسلان، انور پاشا، جلال نوری بے، شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، محمود الحسن، محمد علی، شوکت علی، اقبال، ابوالکلام مرحوم، کسی کا نام بھی مولانا نے نہیں سنا؟ کسی کے کارنامے ان تک نہیں پہنچے؟ کیا ان میں سے کسی نے بھی مسلمانوں کو متنبہ نہیں کیا کہ یہ جاہلیت کی تفریق تم کو تباہ کرنے کے لیے برپا کرائی جا رہی ہے؟ شاید مولانا ان سوالات کا جواب نفی میں نہ دیں گے۔ مگر وہ ان سب واقعات کی طرف سے آنکھیں بند کر کے بے تکلف دعویٰ فرماتے ہیں کہ "افسوس مسلمانوں میں اس وقت کوئی مسلمانوں کی متحدہ قومیت کا واعظ کھڑا نہ ہوا" ____ ایسا غلط دعویٰ کرنے کی آخر ضرورت کیا تھی؟ مقصود صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ پہلے مسلمانوں کی قومی وحدت برطانوی مفاد کے خلاف تھی اس لیے سب مسلمان نسلی، وطنی اور لسانی امتیازات پھیلانے میں لگے ہوئے تھے، اور اب اسلامی وحدت برطانوی اغراض کے لیے مفید ہو گئی ہے، اس لیے اس کا وعظ بھی شروع ہوا ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ وطن پرستی کے مخالف سب کے سب برطانیہ پرست ہیں اور محض ساحر برطانیہ کا سحر ان کے اندر بول رہا ہے! ____ یہ ہے نتیجہ عصبیت جاہلیہ کا۔ چونکہ حق و باطل کا معیار "برطانیہ" ہو گیا اس لیے خلاف واقعہ باتوں کی تصنیف بھی جائز ہو گئی اگر ان سے برطانیہ کے خلاف کوئی کام لیا جا سکے۔

یہی ذہنیت ہے جو ہمیں پورے رسالہ میں کارفرما نظر آتی ہے۔ لغت کو، آیات قرآنی کو، اخبار و احادیث کو، تاریخی واقعات کو، غرض ہر چیز کو توڑ مروڑ کر اپنا مدعا ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور ہر اس چیز کو بلا تکلف نظر انداز کر دیا گیا ہے جو مدعا کے خلاف ہو، چاہے وہ کیسی ہی ظاہر و باہر حقیقت کیوں نہ ہو۔ حد یہ ہے کہ لفظی مغالطے دینے اور قیاس مع الفارق اور بناء فاسد علی الفاسد کا ارتکاب کرنے میں بھی تامل نہیں فرمایا گیا۔ ایک عالم اور متقی عالم کا یہ کارنامہ دیکھ کر انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے کہ اسے کیا کہیے۔

قومیں اوطان سے کہاں بنتی ہیں؟ مولانا فرماتے ہیں کہ "فی زمانا قومیں اوطان سے بنتی ہیں"۔ لیکن یہ ایک قطعی غلط اور سراسر بے بنیاد دعویٰ ہے۔ پوری انسانی تاریخ سے ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جا سکتی کہ کوئی قوم وطن سے بنی ہو۔ آج اس زمانہ میں بھی دنیا کی تمام قومیں مولانا کے سامنے موجود ہیں۔ وہ فرمائیں کہ ان میں سے کون سی قوم وطن سے بنی ہے؟ کیا امریکہ کے حبشی اور ریڈ انڈین اور سفید فام ایک قوم ہیں؟ کیا جرمنی کے یہودی اور جرمن ایک قوم ہیں؟

کیا پولینڈ، روس، ترکی، بلغاریہ، یونان، یوگوسلاویا، چیکوسلواکیا، لتھوانیا، فنلینڈ کسی جگہ بھی خاک وطن کے اشتراک نے ایک قوم بنائی؟ کیا انگلستان، فرانس، اٹلی اور جاپان میں وحدت کا رنگ محض خاکِ وطن نے پیدا کیا ہے؟ کیا ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ یہودی جو روئے زمین کے اطراف واکناف میں منتشر ہیں کسی جگہ بھی وطنی قومیت میں جذب ہو گئے؟ کیا یورپ کے مختلف ممالک میں جرمن، مگیار، سلافی، موراوین وغیرہ مختلف قومی اقلیتیں کسی جگہ بھی وطنی رشتۂ اشتراک میں گم ہوئیں؟ واقعات تو بہرحال واقعات ہیں۔ آپ ان کو اپنی خواہشات کا تابع نہیں بنا سکتے۔ آپ کو یہ کہنے کا حق ہے، اگر آپ ایسا کہنا چاہیں، کہ اب قوموں کو اوطان سے بننا چاہیے۔ لیکن آپ کو ثبوت اور شہادت سے بے نیاز ہو کر دنیا کو یہ غلط خبر دینے کا کیا حق ہے کہ اب قومیں اوطان سے بننے لگی ہیں؟ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ۔

اس میں شک نہیں کہ ایک ملک کے باشندوں کو باہر والے ان کے ملک کی طرف منسوب کرتے ہیں، مثلاً امریکن، خواہ حبشی ہو یا فرنگی، باہر والے اس کو امریکن ہی کہیں گے۔ مگر کیا اس سے یہ حقیقت بدل جاتی ہے کہ امریکہ میں یہ دو الگ الگ قومیں ہیں نہ کہ ایک قوم؟ یہ بھی صحیح ہے کہ بین الاقوامی تعلقات میں ایک شخص اصطلاحاً اس سلطنت کا "نیشنل" کہلاتا ہے جس کی وہ رعایا ہو۔ مثلاً اگر مولانا حسین احمد صاحب بیرون ہند تشریف لے جائیں تو ان کو "برٹش نیشنیلٹی" (برطانوی قومیت) سے منسوب کیا جائے گا۔ لیکن کیا یہ اصطلاحی قومیت حقیقت میں بھی مولانا کی قومیت بدل دے گی؟ پھر بھلا علمی حیثیت سے اس استدلال کی کیا وقعت ہو سکتی ہے کہ "اس وطن کے رہنے والے کی حیثیت سے سب (یعنی ہندو مسلمان سکھ عیسائی پارسی وغیرہ) ایک ہی قوم شمار ہوتے ہیں"؟ شمار ہونے اور فی الواقع ہونے میں بڑا فرق ہے۔ ایک کو دوسرے کے لیے نہ تو دلیل بنایا جا سکتا ہے، اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کو فی الواقع وہی ہونا چاہیے جیسے وہ شمار کیے جاتے ہیں۔

لغت اور قرآن سے غلط استدلال

اس کے بعد مولانا لغت عرب کی طرف رجوع فرماتے ہیں، اور شواہد سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ عربی زبان میں قوم کے معنی ہیں "مردوں کی جماعت"، یا "مردوں اور عورتوں کا مجموعہ"، یا "ایک شخص کے اقربا"، یا "دشمنوں کی جماعت"۔ اس کا ثبوت انھوں نے آیات قرآنی سے بھی پیش فرمایا ہے۔ مثلاً وہ آیات جن میں کفار کو نبی کی یا مسلمانوں کی "قوم" قرار دیا گیا ہے جو صریحاً تیسرے اور چوتھے معنی پر دلالت کرتا ہے۔ یا وہ آیات جن میں

لفظ قوم پہلے یا دوسرے معنی میں مستعمل ہوا ہے لیکن اس پوری بحث میں مولانا کو ایک مرتبہ بھی یہ خیال نہ آیا کہ اس وقت جو بحث در پیش ہے وہ لفظ قوم کے لغوی معنی یا قدیم معنی سے متعلق نہیں ہے بلکہ موجودہ زمانہ کی اصطلاح سے تعلق رکھتی ہے۔ جواہر لال اور سید محمود لغت عرب اور قرآنی زبان میں کلام نہیں کرتے۔ نہ کانگریس کی کارروائیوں میں یہ پرانی زبان استعمال ہوتی ہے۔ ان کے الفاظ کا تو وہی مفہوم ہے اور وہی ہو سکتا ہے جو آج کل ان سے مراد لیا جاتا ہے۔ آج کل اردو زبان میں "قوم" اور "قومیت" کے الفاظ انگریزی زبان کے الفاظ Nation اور Nationalism کے مقابلہ میں بولے جاتے ہیں جن کی تشریح لارڈ برائس نے اپنی کتاب "بین الاقوامی تعلقات" (International Relations) میں بدیں الفاظ کی ہے:۔

"ایک قومیت سے مراد اشخاص کا ایسا مجموعہ ہے جس کو چند مخصوص جذبات (Sentiments) نے ملا کر باہم مربوط کر دیا ہو۔ ان میں سے بڑے اور طاقت ور جاذبے تو دو ہیں۔ ایک جاذبہ نسل۔ دوسرا جاذبہ دین۔ لیکن ایک مشترک زبان کے استعمال اور مشترک لٹریچر سے دلچسپی، اور زمانۂ ماضی کے مشترک قومی کارناموں اور مشترک مصائب کی یاد، اور مشترک رسوم و عوائد، مشترک تخیلات و افکار اور مشترک مقاصد اور حوصلوں کا بھی اس احساس جمعیت کی پیدائش میں بہت کچھ دخل ہوتا ہے۔ کبھی یہ سب رابطے یکجا موجود ہوتے ہیں اور مجموعۂ افراد کو بستہ و پیوستہ رکھتے ہیں۔ اور کبھی ان میں سے بعض رابطے موجود نہیں ہوتے لیکن قومیت پھر بھی موجود ہوتی ہے۔" (صفحہ ۱۱۶)

اسی کی تشریح "اخلاق و ادیان کی دائرۃ المعارف" (Encyclopaedia of Religion and Ethics) میں یوں کی گئی ہے:۔

قومیت وہ وصف عام یا متعدد اوصاف کا ایسا مرکب ہے جو ایک گروہ کے افراد میں مشترک ہو اور ان کو جوڑ کر ایک قوم بنا دے ..... ہر ایسی جماعت ان افراد پر مشتمل ہوتی ہے جو نسل، مشترک روایات، مشترک مفاد، مشترک عادات و رسوم اور مشترک زبان کے رابطوں سے باہم مربوط ہوتے ہیں، اور ان سب سے زیادہ اہم رابطہ ان کے درمیان یہ ہوتا ہے کہ وہ باہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، بلا ارادہ ایک دوسرے کے ساتھ

وابستہ ہوتے ہیں، اور ان کے درمیان مختلف حیثیات سے الفت و موانست ہوتی ہے۔ غیر قوم کا آدمی ان کو غیر اور اجنبی محسوس ہوتا ہے اس لیے کہ اس کی دلچسپیاں اور اس کی عادات انھیں نرالی معلوم ہوتی ہیں، اور ان کے لیے اس کے انداز طبیعت اور اس کے خیالات و جذبات کو سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے قدیم زمانے کے لوگ غیر قوم والوں کو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے، اور اسی وجہ سے آج کا مہذب آدمی بھی غیر قوم والے کی عادات اور طرز زندگی کو اپنے مذاق کے خلاف پاکر ناک بھوں چڑھاتا ہے۔"

کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ قرآنِ مجید نے اس معنی میں کفار و مشرکین اور مسلمانوں کا ایک قومیت میں جمع ہونا جائز رکھا ہے؟ یا کوئی نبی دنیا میں کبھی اس غرض کے لیے بھی بھیجا گیا ہے کہ مومن اور غیر مومن سب کو اس معنی میں ایک قوم بنا دے؟ اگر نہیں تو یہ فضول لغوی بحث آخر کیوں چھیڑی جاتی ہے؟ لفظ اپنے معنی تاریخ کے دوران میں بارہا بدلتا ہے۔ کل ایک لفظ کسی معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ آج کسی اور معنی میں ہوتا ہے۔ اب یہ لفظی مغالطہ نہیں تو اور کیا ہے کہ آپ معنوی تغیرات کو نظر انداز کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائیں کہ قرآن کی رو سے "قومیت میں اشتراک مسلم اور کافر کا ہو سکتا ہے"، درآنحالیکہ قومیت کا جو مفہوم قرآن کی زبان میں تھا اس کو آج کے مفہوم سے ذرہ برابر کوئی علاقہ نہیں۔ متقدمین نے "مکروہ" اور "حرام" میں اصطلاحی فرق نہیں کیا تھا اس لیے اکثر مقامات پر ان کی عبارتوں میں مکروہ بمعنی حرام مستعمل ہوا ہے۔ لیکن اب کہ ممنوعیت کے ان دونوں مدارج کے لیے الگ اصطلاحیں بن چکی ہیں، اگر کوئی شخص کسی حرام کو محض مکروہ بمعنی اصطلاحی ٹھیرائے اور حجت کے طور پر سلف کی کوئی عبارت پیش کرے تو کیا یہ مغالطہ کے سوا کچھ اور ہوگا؟ اسی طرح لفظ قومیت بھی اب اصطلاح بن چکا ہے۔ اب مسلم و کافر کے لیے مشترک قومیت کا لفظ استعمال کرنا، اور معترض کا منہ بند کرنے کے لیے اس لفظ کے پرانے استعمالات کو حجت میں پیش کرنا بھی محض ایک مغالطہ ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔

ایک اور لفظی مغالطہ آگے چل کر مولانا دعوٰی فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینۂ طیبہ میں یہود اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت بنائی تھی، اور اس کے ثبوت میں وہ معاہدہ پیش کرتے ہیں جو ہجرت کے بعد حضور اکرم اور یہودیوں کے درمیان ہوا تھا۔ اس معاہدہ میں کہیں یہ فقرہ مولانا کے ہاتھ آگیا کہ

وان یھود بنی عوف امۃ مع المومنین — بنی عوف کے یہودی مسلمانوں کے ساتھ ایک "امت" ہوں گے۔

بس یہ فقرہ کہ "یہودی اور مسلمان ایک امت ہوں گے"، یہ دعویٰ کرنے کے لیے کافی سمجھ لیا گیا کہ آج بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کی متحدہ قومیت بن سکتی ہے۔ لیکن یہ پھر لفظی مغالطہ ہے۔ لغت عرب میں امت سے مراد ہر وہ جماعت ہے جس کو کوئی چیز جمع کرتی ہو، عام اس سے کہ وہ زمانہ ہو، مقام ہو، دین ہو یا کوئی اور چیز۔ اس لحاظ سے اگر دو مختلف قومیں کسی ایک مشترک مقصد کے لیے عارضی طور پر متفق ہو جائیں تو ان کو بھی ایک امت کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ صاحب لسان العرب لکھتے ہیں :۔

وقولہ فی الحدیث ان یھود بنی عوف امۃ من المومنین یرید انھم بالصلح الذی وقع بینھم وبین المومنین کجماعۃ منھم کلمتھم وایدیھم واحدۃ	حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ ان یھود بنی عوف امۃ من المومنین، اس سے مراد یہ ہے کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان جو صلح واقع ہوئی ہے اس کی وجہ سے یا وہ گویا مسلمانوں ہی کی ایک جماعت ہو گئے ہیں اور ان کا معاملہ واحد ہے

اس لغوی "امت" کو آج کی اصطلاحی "متحدہ قومیت" سے کیا واسطہ؟ زیادہ سے زیادہ اس کو آج کل کی سیاسی زبان میں فوجی اتحاد (Military alliance) کہہ سکتے ہیں۔ یہ محض ایک تحالف تھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہود اپنے دین پر اور مسلمان اپنے دین پر رہیں گے، دونوں کی تمدنی و سیاسی ہیئتیں الگ الگ رہیں گی، البتہ ایک فریق پر جب کوئی حملہ کرے گا تو دونوں فریق مل کر لڑیں گے، اور دونوں اس جنگ میں اپنا اپنا مال خرچ کریں گے۔ دو تین سال کے اندر ہی اس تحالف کا خاتمہ ہو گیا اور مسلمانوں نے کچھ یہودیوں کو جلا وطن اور کچھ کو ہلاک کر دیا۔ کیا اسی کا نام "متحدہ قومیت" ہے؟ کیا کسی معنی میں بھی یہ چیز اس "متحدہ قومیت" سے مماثلت رکھتی ہے جو اس وقت معرض بحث میں ہے؟ کیا وہاں کوئی مشترک اسٹیٹ بنایا گیا تھا؟ کیا وہاں کوئی مشترک مجلس قانون ساز بنائی گئی تھی اور یہ طے ہوا تھا کہ یہودی اور مسلمان ایک مجموعہ ہوں گے اور اس مجموعہ میں سے جس کی اکثریت ہو گی وہی مدینہ پر حکومت کرے گا اور اسی کے منظور کیے ہوئے قوانین مدینہ میں نافذ ہوں گے؟ کیا وہاں مشترک عدالتیں قائم ہوئی تھیں جن میں یہودیوں اور

مسلمانوں کے قضایا کا یکجا اور ایک ہی ملکی قانون کے تحت فیصلہ ہوتا ہو؟ کیا وہاں کوئی وطنی کانگریس بنائی گئی تھی جس میں یہودی اکثریت کا منتخب کیا ہوا ہائی کمانڈ اپنی انگلیوں پر یہودی اور مسلمان سب کو رقص کراتا ہو؟ کیا وہاں رسول اللہ سے معاہدہ کرنے کے بجائے کعب بن اشرف اور عبداللہ بن ابی براہ راست افراد مسلمین سے ماس کانٹیکٹ کرنے گئے تھے؟ کیا وہاں وردھا اسکیم کے طرز کی کوئی تعلیمی اسکیم تصنیف کی گئی تھی تاکہ مسلمان اور یہودی بچے ایک مشترک سوسائٹی بنانے کے لیے تیار کیے جائیں اور ان کو یہودیت اور اسلام کی صرف مشترک سچائیاں ہی پڑھائی جائیں؟ کیا وہاں بھی کسی ابورافع نے کوئی "صومعہ اسکیم" تمام اہل مدینہ کے لیے بنائی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تعلیمی صومعوں میں مسلمان بچوں کا بھیجا جانا قبول فرمالیا تھا؟ مولانا آخر فرمائیں تو کہ جس "متحدہ قومیت" کو وہ رسول خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں اس میں آج کل کی "متحدہ قومیت" کے عناصر ترکیبی میں سے کونسا عنصر پایا جاتا تھا؟ اگر وہ کسی ایک عنصر کا بھی پتہ نہیں دے سکتے، اور میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہرگز نہیں دے سکتے تو کیا مولانا کو خدا کی بازپرس کا خوف نہیں کہ محض امۃ من المومنین یا امۃ مع المومنین کے الفاظ معاہدۂ نبوی میں دیکھ کر وہ مسلمانوں کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ جیسی متحدہ قومیت آج کانگریس بنا رہی ہے ویسی ہی متحدہ قومیت کل نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی بنا چکے ہیں لہٰذا آؤ اور اطمینان سے اس میں جذب ہو جاؤ؟ الفاظ کا سہارا لے کر مولانا نے اپنا مدعا ثابت کرنے کی کوشش تو بہت خوبی کے ساتھ کر دی، مگر انہیں یہ خیال نہ آیا کہ حدیث کے الفاظ کو مفہوم نبوی کے خلاف کسی دوسرے مفہوم پر چسپاں کرنا، اور اس مفہوم کو نبی کی طرف منسوب کر دینا من کذب علی متعمدا کی زد میں آجاتا ہے۔ مولانا خود ایک جلیل القدر عالم اور محدث ہیں۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر کوئی شخص حدیث عائشہ کان النبی صلعم یقبل و یباشر وھو صائم۔ کے لفظ مباشرت کو اردو کے معروف معنوں میں لے اور اس سے یہ استدلال کرے کہ روزے میں مباشرت کرنا نعوذ باللہ سنت سے ثابت ہے۔ لہٰذا سب مسلمانوں کو روزے میں مباشرت کرنی چاہیے تو آپ اس پر کیا حکم لگائیں گے؟ دونوں استدلالوں کی نوعیت ایک ہے لہٰذا ان کا حکم بھی ایک ہی ہونا چاہیے اور کوئی وجہ نہیں کہ مستدل کی شخصیت کو دیکھ کر اس باب میں رعایت کی جائے۔ بلکہ اگر مستدل ان لوگوں میں سے ہے جن کی طرف

مسلمان اعتماد اور بھروسے کے ساتھ اپنے دین کا علم حاصل کرنے کے لیے رجوع کرتے ہیں، تو معاملہ اور زیادہ اشد ہو جاتا ہے جب شفاخانے ہی سے زہر تقسیم ہونے لگے تو امن کہاں تلاش کیا جائے؟

بنار فاسد علی الفاسد | پھر مولانا اس متحدہ قومیت کے جواز میں ایک اور دلیل پیش فرماتے ہیں اور وہ یہ ہے:-

"ہم روزانہ مفاد ہائے مشترکہ کے لیے ہیأت اجتماعیہ بناتے ہیں اور ان میں نہ صرف شریک ہوتے ہیں بلکہ ان کی ممبری اور شرکت کے لیے انتہائی جد وجہد کرتے ہیں .... ٹاؤن ایریا، نوٹیفائیڈ ایریا، میونسپل بورڈ، ڈسٹرکٹ بورڈ، کونسلات، اسمبلیاں، ایجوکیشنل ایسوسی ایشن اور اس قسم کی سینکڑوں انجمنیں اور ایسوسی ایشنیں ہیں جو کہ انہی اصولوں اور قواعد سے عبارت ہیں جو کہ خاص مقصد کے ماتحت ہیئت اجتماعیہ کے لیے بنائے گئے ہیں۔ تعجب ہے کہ ان میں حصہ لینا اور مکمل یا غیر مکمل جد وجہد کرنا ممنوع قرار نہیں دیا جاتا مگر اسی قسم کی کوئی انجمن اگر آزادی ملک اور برطانوی اقتدار کے خلاف قائم ہو تو وہ حرام، خلافِ دیانت، خلافِ تعلیماتِ اسلامیہ اور خلافِ عقل و دانش وغیرہ ہو جاتی ہے۔" (صفحہ ۱۴)

یہ بنار فاسد علی الفاسد ہے۔ ایک گناہ کو جائز فرض کرکے اس کی حجت پر مولانا اُسی قسم کے دوسرے گناہ کو جائز ثابت کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ دونوں میں ایک ہی علتِ حرمت پائی جاتی ہے اور مقیس و مقیس بہ دونوں ناجائز ہیں تاوقتیکہ یہ علّت اُن سے دور نہ ہو۔ علمائے کرام مجھے معاف فرمائیں، میں صاف کہتا ہوں کہ ان کے نزدیک کونسلوں اور اسمبلیوں کی شرکت کو ایک دن حرام اور دوسرے دن حلال کر دینا ایک کھیل بن گیا ہے ایسے کہ ان کی تحلیل و تحریم حقیقتِ نفس الامری کے ادراک پر تو مبنی ہے نہیں، محض گاندھی جی کی جنبش لب کے ساتھ ان کا فتویٰ گردش کیا کرتا ہے لیکن میں اسلام کے غیر تغیر پذیر اصولوں کی بنا پر یہ کہتا ہوں کہ ہر اس اجتماعی ہیئت کو تسلیم کرنا مسلمانوں کے لیے ہمیشہ گناہ تھا، آج بھی گناہ ہے اور ہمیشہ گناہ رہے گا جس کا دستور انسانوں کو اس امر کا اختیار دیتا ہو کہ وہ اُن مسائل کے متعلق قانون بنائیں یا ان مسائل کا تصفیہ کریں، جن پر خدا اور اس کا رسول پہلے اپنا ناطق فیصلہ دے چکا ہو۔ اور یہ گناہ اس صورت میں اور زیادہ شدید ہو جاتا ہے جبکہ ایسے اختیارات رکھنے والی

اجتماعی ہیئت میں اکثریت غیرمسلموں کی ہو، اور فیصلہ کا مدار کثرت رائے پر ہو۔ ان اجتماعی ہیئتوں کے حدود اختیار و عمل کو خدا کی شریعت کے حدود سے الگ کر دینا مسلمانوں کا اولین فرض ہے اور اصلی جنگ آزادی ان کے لیے یہی ہے۔ اگر یہ حدود الگ ہو جائیں تو بلاشبہ ہر اُس جماعت میں شریک ہونا اور پورا پورا تعاون کرنا مسلمانوں کے لیے جائز ہو گا جو مسلمانوں اور غیرمسلموں کی مشترک اغراض کے لیے بنائی جائے عام اس سے کہ وہ آزادی ملک کے لیے ہو یا انتظامِ مملکت کے لیے، یا معاشی و صنعتی کاروبار کے لیے لیکن جب تک حدود ایک دوسرے گڈمڈ ہیں، اشتراک و تعاون تو درکنار، ایسے دستور کے تحت زندگی بسر کرنا بھی مسلمانوں کے لیے گناہ ہے۔ اور یہ اجتماعی گناہ ہے جس میں من و تو کی تمیز نہیں۔ ساری قوم اس وقت تک گناہ گار رہے گی جب تک کہ وہ اس دستور کو پارہ پارہ نہ کر دے۔ اور اس میں ان لوگوں کا گناہ شدید تر ہو گا جو اس دستور پر راضی ہوں گے اور اسے چلانے میں حصہ لیں گے۔ اور اس شخص کا گناہ شدید ترین ہو گا جو خدا کی شریعت اور اس کے رسول کی سنت کو اس کے لیے دلیل جواز بنائے گا، کائناً من کان۔

میرے نزدیک یہ نہ تفقہ ہے اور نہ تقویٰ کہ جس چیز میں ایک علت حرمت کی اور دوسری علت جواز کی بیک وقت پائی جاتی ہو، اس میں سے محض علتِ جواز کو الگ نکال کر حکم لگا دیا جائے اور علتِ حرمت کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ آپ آزادی ملک اور برطانوی اقتدار کے خلاف جد و جہد کا نام تو جھٹ لے دیتے ہیں کہ اسے کون نہ جائز بلکہ فرض کہے گا۔ لیکن یہ نام لیتے وقت آپ کو یہ یاد نہیں آتا کہ جو انجمن آپ کے زعم کے مطابق آزادی کے لیے جد و جہد کر رہی ہے، وہی انجمن اُس دستور کو قبول کرتی ہے، اُسے چلاتی ہے، اور اُسی کو درجۂ کمال تک پہنچانے کے لیے لڑ رہی ہے جو انسانی مجلس قانون ساز کو خدا کے قانون میں ترمیم کرنے کا اختیار دیتا ہے، جس کی رو سے خدا کا قانون اگر نافذ ہو بھی سکتا ہے تو صرف اس وقت جبکہ اسے لیجسلیچر کی منظوری حاصل ہو جائے، جس کے تحت غیرمسلم اکثریت کو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا نقشہ بنانے اور بگاڑنے کے پورے اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور وہ ان کے اخلاق، ان کی معاشرت اور ان کی آئندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت پر ہر قسم کے اثرات ڈال سکتی ہے۔ ایسے دستور کے ساتھ جو آزادی ملک حاصل ہوتی ہو، آپ اس کے پیچھے دوڑتے ہیں، کیونکہ آپ کو صرف برطانوی اقتدار کا زوال مطلوب ہے عام اس سے کہ وہ کسی صورت میں ہو۔ اسی لیے آپ ایسی

انجمن کے معاملہ میں صرف علت جواز ہی ڈھونڈھتے ہیں اور علتِ حرمت جو سامنے منہ کھولے کھڑی ہے، آپ کو کسی طرح نظر نہیں آتی لیکن ہم مجبور ہیں کہ ان دونوں پہلوؤں کو ساتھ ساتھ دیکھیں اور علتِ حرمت کو دفع کیے بغیر علتِ جواز کو قبول نہ کریں، اس لیے کہ ہم کو برطانوی اقتدار کا زوال اور اسلام کا بقا دونوں ساتھ ساتھ مطلوب ہیں۔ اس کا نام اگر کوئی برطانیہ پرستی رکھتا ہے تو رکھے، ہمیں اس کے طعن کی ذرہ برابر پروا نہیں۔

افسوسناک بے خبری مولانا ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

"(متحدہ وطنی قومیت) کی مخالفت کا فتویٰ صرف اس بنا پر کہ وطنیت کا مفہوم مغرب کی اصطلاح میں آج ایسے اصولوں پر اطلاق کیا جاتا ہے جو کہ ہیئت اجتماعیہ انسانیہ سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ یکسر مخالف مذہب ہیں، اسی مفہوم مصطلح سے مخصوص ہوگا۔ مگر یہ مفہوم نہ عام طور پر لوگوں کے ذہن نشین ہے اور نہ اس کا کوئی مسلمان دیانت دار قائل ہوسکتا ہے اور نہ ایسے مفہوم کی اس وقت تحریک ہے۔ کانگریس اور اس کے کارکن اس کے محرک نہیں ہیں اور نہ اس کو ہم ملک کے سامنے پیش کر رہے ہیں"۔

(صفحہ ۴۱)

اس دعوے کے ثبوت میں وہی پامال چیز پھر سامنے لائی گئی ہے جس کی حقیقت ایک سے زیادہ مرتبہ کھولی جاچکی ہے، "یعنی بنیادی حقوق" کا اعلان اور اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ:۔

"خود کانگریس بھی جس متحدہ قومیت کو ہندوستان میں پیدا کرنا چاہتی ہے اس میں کوئی ایسی بات نہیں چاہتی جس سے اہل ہند کے مذاہب یا ان کے کلچر و تہذیب اور پرسنل لا پر کسی قسم کا ضرر رساں اثر پڑے۔ وہ فقط انہی امور کو درست کرنا اور سلجھانا چاہتی ہے جو کہ مشترک مفاد اور ضروریاتِ ملکیہ سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کو پردیسی حکومت نے اپنے قبضہ میں لے کر عام باشندگانِ ہند کو فنا کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ عموماً یہ امور وہی ہیں جو کہ ٹاؤن ایریا، نوٹیفائڈ ایریا، میونسپل بورڈوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں، کونسلوں، اسمبلیوں وغیرہ میں داخلی اور خارجی حیثیات سے طے کیے جاتے ہیں۔ ان میں کسی قوم یا مذہب

کا دوسری قوم یا مذہب میں جذب ہو جانا ملحوظ نظر نہیں ہے۔" (صفحہ ۵)

یہ تحریر ایک روشن نمونہ ہے اس امر کا کہ اس نازک وقت میں کیسی سطح بینی اور کیسی سہل انگاری کے ساتھ مسلمانوں کی پیشوائی کی جا رہی ہے۔ جن مسائل پر آٹھ کروڑ مسلمانوں کے مستقبل کا انحصار ہے، جن میں ایک ذراسی چوک بھی قوم کی آئندہ صورتِ اجتماعی و اخلاقی کو بگاڑ کر کچھ سے کچھ کر دے سکتی ہے، ان کے تصفیہ کو ایسا ہلکا اور آسان کام سمجھ لیا گیا ہے کہ اس کے لیے اُتنے مطالعہ اور غور و خوض اور تدبر کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی جس کا اہتمام ایک فردِ واحد کو طلاق اور وراثت کا کوئی جزئی مسئلہ بتانے میں کیا جاتا ہے۔ عبارت کا ایک ایک لفظ شہادت دے رہا ہے کہ مولانا نہ تو قومیت کے اصطلاحی مفہوم کو جانتے ہیں، نہ کانگریس کے مقصد و مدعا کو سمجھتے ہیں، نہ بنیادی حقوق کے معنی پر انھوں نے غور کیا ہے، نہ ان کو یہ خبر ہے کہ جن اجتماعی مجلسوں کا وہ بار بار اس قدر سادگی کے ساتھ ذکر فرما رہے ہیں ان کے حدود اختیار و عمل موجودہ دستور کے تحت کس طرح اور کن کن راہوں سے اُس دائرے میں نفوذ کرتے ہیں جس کو تہذیب و تمدن اور عقائد و اخلاق کا دائرہ کہا جاتا ہے۔ حد یہ ہے ـــــ اور یہ بات میں خوب سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں ـــــ کہ مولانا با ایں ہمہ علم و فضل کلچر، تہذیب، پرسنل لا وغیرہ الفاظ بھی جس طرح استعمال کر رہے ہیں اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ ان کے معنی و مفہوم سے نا آشنا ہیں۔ میری یہ صاف گوئی ان حضرات کو یقیناً بہت بری معلوم ہوگی جو رجال کو حق سے پہچاننے کے بجائے حق کو رجال سے پہچاننے کے خوگر ہیں، اور اس کے جواب میں چند اور گالیاں سننے کے لیے میں نے اپنے آپ کو پہلے ہی تیار کر لیا ہے۔ مگر میں جب دیکھتا ہوں کہ مذہبی پیشوائی کی مسندِ مقدس سے مسلمانوں کی غلط رہنمائی کی جا رہی ہے، ان کو حقائق کے بجائے اوہام کے پیچھے چلایا جا رہا ہے، اور خندقوں سے بھری ہوئی راہ کو شاہراہ مستقیم بتا کر انھیں اس کی طرف دھکیلا جا رہا ہے، تو میں کسی طرح اس پر صبر نہیں کر سکتا، کوشش بھی کروں تو میرے اندر اس پر صبر کی طاقت نہیں ہے، لہٰذا مجھے اس پر راضی ہو جانا چاہیے کہ جو کوئی میری صاف گوئی پر ناراض ہوتا ہو ہو جائے وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ۔

وطنی قومیت کا حقیقی مدعا معنی قومیت کی تشریح کے لیے اُن عبارات پر پھر ایک نظر ڈال لیجیے جو اسی مضمون میں

لارڈ برائس کی کتاب "بین الاقوامی تعلقات" اور "اخلاق و ادیان کی دائرۃ المعارف" سے نقل کی گئی ہیں۔ اس معنی کے اعتبار سے افراد کو قوم بنانے والی چیز اصلاً اور ابتداءً ایک ہی ہے اور وہ کوئی ایسا جاذبہ ہے جو ان سب میں روح بن کر پھیل جائے اور ان کو ایک دوسرے سے مربوط کر دے لیکن محض اس جاذبہ کا موجود ہونا قوم بنانے کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ اس کو اتنا طاقتور ہونا چاہیے کہ وہ تمام اُن داعیات کو دبا دے جو افراد کو، یا افراد کے چھوٹے چھوٹے مجموعوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے والے ہوں۔ اس لیے کہ علیحدہ کرنے والی چیزیں اگر اس جوڑنے والے جاذبہ کی مزاحمت کرنے کے لیے کافی تیز ہوتا ہوں تو وہ جوڑنے کے عمل میں کامیاب نہیں ہوسکتا، یا بالفاظ دیگر "قوم" نہیں بنا سکتا۔ علاوہ بریں تشکیل قومیت کے لیے زبان، ادب، تاریخی روایات، رسوم و عادات، معاشرت اور طرز زندگی، افکار اور تخیلات، معاشی مفاد اور مادی اغراض کی مدد بھی درکار ہوتی ہے۔ یہ سب چیزیں ایسی ہونی چاہئیں جو اس جوڑنے والے جاذبہ کی فطرت سے مناسبت رکھتی ہوں یعنی ان کے اندر کوئی عنصر ایسا نہ ہو جو علیحدگی کے احساس کو زندہ رکھنے والا ہو، اس لیے کہ یہ سب کی سب ایسی طاقتیں ہیں جو افراد کو مجتمع کرنے میں اثر رکھتی ہیں اور یہ جوڑنے کے عمل میں اس کلمۂ جامعہ کی مددگار صرف اسی طرح ہوسکتی ہیں کہ ان سب کا میلان اسی مقصود کی طرف ہو جو اس کلمۂ جامعہ کا مقصود ہے۔ ورنہ بصورت دیگر یہ دوسرے ڈھنگ پر جماعت سازی کریں گی اور قوم بنانے کا عمل ناقص رہ گا۔

اب غور کیجیے کہ جس ملک میں اس معنی کے لحاظ سے مختلف قومیں رہتی ہوں ان کو متفق کرنے کی کیا صورتیں ممکن ہیں۔ آپ جتنا بھی غور کریں گے، آپ کو صرف دو ہی ممکن العمل صورتیں نظر آئیں گی:-

ایک یہ کہ ان قوموں کو ان کی قومیتوں کے ساتھ برقرار رکھ کر ان کے درمیان واضح اور متعین شرائط کے ساتھ ایک ایسا وفاقی معاہدہ ہو جائے جس کی رو سے وہ صرف مشترک اغراض و مقاصد کے لیے مل کر عمل کریں اور باقی امور میں بالفعل خود مختار ہوں۔ کیا کانگریس نے فی الواقع یہ طریقہ اختیار کیا ہے؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ان قوموں کو "ایک قوم" بنا دیا جائے۔ یہی دوسری صورت کانگریس چاہتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ قومیں ایک قوم کس طرح بن سکتی ہیں؟ لامحالہ ان کے لیے سب سے پہلے تو ایک مشترک جاذبہ،

ایک جامع کلمہ درکار ہے، اور وہ جاذبہ یا کلمہ صرف تین چیزوں ہی سے مرکب ہو سکتا ہے: وطن پرستی، بیرونی دشمن سے نفرت اور معاشی مفاد سے دلچسپی۔ پھر جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں، قوم بنانے کے لیے شرط لازم یہ ہے کہ یہ جاذبہ اتنا قوی ہو کہ دوسرے تمام جاذبے جنھوں نے ان قوموں کو الگ الگ اقوام بنا رکھا ہے اس کے سامنے دب جائیں! کیونکہ اگر مسلمان کو اسلام سے، ہندو کو ہندویت سے، سکھ کو سکھیت سے اتنی دلچسپی ہو کہ جب مذہب یا قومیت کا معاملہ سامنے آئے تو مسلمان، مسلمان کے ساتھ، اور ہندو ہندو کے ساتھ اور سکھ سکھ کے ساتھ جڑ جائے اور اس قومی (یا وطن پرستوں کی زبان میں فرقہ وارانہ) معاملہ کی حمایت کے لیے ایک جماعت بن کر اٹھ کھڑا ہو، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جاذبۂ وطن نے ان کو ایک قوم نہیں بنایا۔ یہ امر دیگر ہے کہ مسلمان اسلام کا قائل رہے اور نماز بھی پڑھ لیا کرے، اور ہندو، ہندویت کا معتقد رہے اور مندر بھی چلا جایا کرے، لیکن ایک قوم بننے کے لیے شرط اول یہ ہے کہ اس کی نگاہ میں وطنیت کی کم از کم اتنی اہمیت ضرور ہو کہ اسلام کو اور ہندویت یا سکھیت کو وہ اس پر قربان کر سکتا ہو۔ اس کے بغیر "وطنی قومیت" قطعاً بے معنی ہے۔

یہ تو وطنی قومیت کا تخم ہے۔ مگر یہ تخم بارآور نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے لیے مناسب آب و ہوا، مناسب زمین اور مناسب موسم نہ ہو۔ اوپر عرض کر چکا ہوں کہ جاذبۂ قومی کی مدد کے لیے ضروری ہے کہ زبان، ادب، تاریخی روایات، رسوم و عادات، معاشرت اور طرز زندگی، افکار اور تخیلات، معاشی اغراض اور مادی مفاد، غرض تمام وہ چیزیں جو انسانی جماعتوں کی تالیف و ترکیب میں فی الجملہ اثر رکھتی ہیں، اسی ایک جاذبۂ قومی کی فطرت میں ڈھلی ہوئی ہوں۔ اس لیے کہ افراد کو جوڑنے والی ان مختلف طاقتوں کا میلان اگر علیحدگی کی جانب ہو تو یہ جذب اور تالیف اور اجتماع کے عمل میں اس جاذبہ کی الٹی مزاحمت کریں گی اور متحد قوم نہ بننے دیں گی۔ لہٰذا ایک وطنی قوم بنانے کے لیے یہ بالکل ناگزیر ہے کہ ان سب چیزوں میں سے اُن عناصر کو نکالا جائے جو مختلف قوموں کے اندر جداگانہ قومیت کی روح پیدا کرتے اور زندہ رکھتے ہیں، اور ان کے بجائے ایسے رنگ میں ان کو ڈھالا جائے کہ وہ آہستہ آہستہ تمام افراد اور طبقوں اور گروہوں کو ہم رنگ کر دیں، ان کو ایک سوسائٹی بنا دیں، ان کے اندر ایک مشترک

اجتماعی مزاج اور مشترک اخلاقی روح پیدا کر دیں، ان کے اندر ایک طرح کے جذبات و احساسات پھونک دیں، اور ان کو ایسا بنا دیں کہ ان کی معاشرت ایک ہو، طرز زندگی ایک ہو، ذہنیت اور انداز فکر ایک ہو، ایک ہی تاریخی سرچشمے سے وہ افتخار کے جذبات اور روح کو حرکت میں لانے والے محرکات حاصل کریں، اور ان کے درمیان ایک دوسرے کے لیے کسی چیز میں بھی کوئی نرالا پن باقی نہ رہے۔

اسی مقصد کے لیے وردھا اسکیم بنائی گئی ہے اور یہی مقصد ودیا مندر اسکیم کا ہے، جیسا کہ دونوں اسکیموں میں صاف صاف لکھ بھی دیا گیا ہے۔ مگر مولانا نے ان اسکیموں اور ان کے نصاب کو نہیں دیکھا۔ اسی قومیت کا صور برسوں سے پنڈت جواہر لال پھونک رہے ہیں مگر ان کی بھی کوئی تحریر و تقریر مولانا کی سماعت و بصارت تک پہنچنے کا موقع نہ پا سکی۔ یہی چیز کانگریس کا ایک ایک ذمہ دار آدمی کہہ رہا ہے، لکھ رہا ہے، اور اس کے لیے اُن حاکمانہ طاقتوں سے کام لے رہا ہے جو نئے دستور نے عطا کی ہیں، مگر نہ مولانا کے کان ان باتوں کو سنتے ہیں اور نہ ان کی آنکھیں ان چیزوں کو دیکھتی ہیں۔ اسی چیز کے لیے ان تمام اجتماعی ہیئتوں اور مجلسوں سے کام لیا جا رہا ہے جن کی فہرست مولانا بار بار گنایا کرتے ہیں، اور یہ مجالس محض اس وجہ سے اس کام میں ان کی مددگار بن گئی ہیں کہ ان کا دائرۂ عمل ان تمام معاملات پر چھایا ہوا ہے جن کو آپ تہذیب، کلچر، پرسنل لا وغیرہ ناموں سے یاد فرماتے ہیں۔ مگر یہ عمل جو ہر آن ہندوستان کے ہر حصہ میں ہو رہا ہے، اس کی بھی کسی جنبش کو مولانا کے حواس خمسہ تک رسائی حاصل نہ ہو سکی۔ اس پورے مواد میں سے صرف ایک ہی دستاویز ان تک پہنچی ہے جس کا نام "بنیادی حقوق" ہے اور بس اُسی کے اعتماد پر مولانا اس "متحدہ قومیت" کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے تشبیہ دینے کی جرأت فرما رہے ہیں، حالانکہ ان بنیادی حقوق کی حیثیت ملکۂ وکٹوریہ کے مشہور اعلان سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے اور مغربی ڈپلومیسی کی ایسی چالوں کا رشتہ رسولِ پاک کے عمل سے جوڑنے کی جسارت ہم جیسے گناہ گاروں کے بس کی بات تو نہیں ہے۔ ہاں جن کے پاس تقویٰ کا زاد راہ اتنا زیادہ ہے کہ وہ ایسی جسارتیں کرنے پر بھی بخشش کی امید رکھتے ہیں، انھیں اختیار ہے کہ جو چاہیں کہیں اور جو چاہیں لکھیں۔

اشتراکِ لفظی کا فتنہ مولانا نے اپنے ذہن میں "متحدہ قومیت" کا ایک خاص مفہوم متعین کر رکھا ہے جس کے حدود انھوں نے تمام شرعی شرائط کو ملحوظ رکھ کر اور تمام امکانی اعتراضات سے پہلو بچا کر خود مقرر فرمائے ہیں، اور ان کو ایسی پُر احتیاط مفتیانہ زبان میں بیان فرمایا ہے کہ قواعدِ شرعیہ کے لحاظ سے کوئی اس پر حرف نہ لاسکے۔ لیکن اس میں خرابی بس اتنی ہی ہے کہ اپنے مفہومِ ذہنی کو مولانا کانگریس کا مفہوم و مدعا قرار دے رہے ہیں، حالانکہ کانگریس اس سے بمراحل دور ہے۔ اگر مولانا صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتے کہ "متحدہ قومیت" سے میری مراد یہ ہے، تو ہمیں ان سے جھگڑا کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن وہ آگے قدم بڑھا کر فرماتے ہیں کہ نہیں، کانگریس کی مراد بھی یہی ہے، اور کانگریس بالکل نبی صلعم کے اسوہ پر چل رہی ہے، اور مسلمانوں کو مامون و مطمئن ہو کر اپنے آپ کو اس متحدہ قومیت کے حوالہ کر دینا چاہیے جسے کانگریس بنانا چاہتی ہے۔ یہیں سے ہمارے اور ان کے درمیان نزاع کا آغاز ہوتا ہے۔ فرض کیجیے کہ "پانی ڈالنے" سے آپ کا مفہومِ ذہنی "پانی ڈالنا" ہی ہو، لیکن دوسرے نے "آگ لگانے" کا نام "پانی ڈالنا" رکھ چھوڑا ہو، تو آپ کتنا ظلم کریں گے اگر اختلافِ معنی کو نظر انداز کر کے لوگوں کو مشورہ دینے لگیں کہ اپنا گھر اس شخص کے حوالہ کر دو جو "پانی ڈالنے" کے لیے کہتا ہے۔ ایسے ہی مواقع کے لیے تو قرآنِ مجید میں ہدایت کی گئی تھی کہ جب ایک لفظ ایک صحیح معنی اور ایک غلط معنی میں مشترک ہو جائے اور تم دیکھو کہ اعدارِ دین اس اشتراکِ لفظی سے فائدہ اٹھا کر فتنہ برپا کر رہے ہیں تو ایسے لفظ ہی کو چھوڑ دو۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوا ۗ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ (بقرہ۔ ۱۲) لہٰذا مولانا کو اپنے مفہومِ ذہنی کے لیے تحالُف، یا وفاق یا اسی قسم کا کوئی مناسب لفظ اختیار کرنا چاہیے تھا، اور اس وفاق یا تحالُف کو بھی اپنی تجویز کی حیثیت سے پیش کرنا چاہیے تھا، نہ اس حیثیت سے کہ یہ کانگریس کا عمل ہے۔ کم از کم اب وہ امت پر رحم فرما کر اپنی غلطی محسوس فرمالیں ورنہ اندیشہ ہے کہ ان کی تحریریں ایک فتنہ بن کر رہ جائیں گی اور اس پرانی سنت کا اعادہ کریں گی کہ ظالم امرا اور فاسق اہلِ سیاست نے جو کچھ کیا اس کو علما کے ایک گروہ نے قرآن و حدیث سے درست ثابت کر کے ظلم و طغیان کے لیے مذہبی ڈھال فراہم کر دی۔ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ۔

ہندوستان کا مجددِ اعظم

اور

ماہنامہ "الفرقان" کا مجددِ الف ثانی نمبر

(مسلمانانِ ہند کے مذہبی و سیاسی اختلافات کا ناطق فیصلہ)

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ قدسی صفات پر سرزمینِ ہند جس قدر بھی ناز کرے کم ہے۔ آپ پیغمبر تھے لیکن آپ کا اندازِ دعوت و اصلاح پیغمبرانہ تھا۔ آپ کے دور زندگی میں ہندوستان کے مذہبی و سیاسی حالات قریب قریب بالکل ویسے ہی تھے جن میں آج اسلامیانِ ہند گھرے ہوئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے جس ربانی ہدایت و انشراحِ صدر سے کام لیکر ان نامساعد حالات کا مقابلہ کیا تھا آج بھی اس و تنی راہ کو فراہم کر کے ملتِ اسلامیہ کا تحفظ اور شریعتِ الٰہیہ کا احیا کیا جائے انہیں حالات کے پیشِ نظر ادارہ "الفرقان" نے "مجدد نمبر" شائع کیا ہے جو تقریباً ڈھائی سو صفحات پر نہایت آب و تاب کے ساتھ ماہِ شوال میں شائع ہوا تھا۔ ادارہ نے نہایت سرگرمی کے ساتھ اُس کی تیاری میں حصہ لیا الحمد للہ کہ ملک کے اکابر علماء و مشائخ، مشاہیر اہل قلم و اربابِ تحقیق کے بلند پایہ مقالات اور محققانہ مضامین کا غیر معمولی سرمایہ فراہم ہو چکا ہے اور یقین ہے کہ یہ نمبر حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے حالات، کمالات، ملفوظات و مقالات غرض آپ کی پوری زندگی کا نہایت آب و تابناک آئینہ ہو گا جو حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی تمام سوانح حیات سے بے نیاز بنا دے گا۔ اعلیٰ ایڈیشن کی قیمت عہ (ایک روپیہ آٹھ آنہ) معمولی ایڈیشن کی قیمت عہ (ایک روپیہ) مستقل خریداروں کو مفت دیا جائے گا، نئے خریداروں کو بھی مفت دیا جائے گا بشرطیکہ وہ چندہ خریداری جلد از جلد دفتر کو روانہ کر دیں۔

چندہ سالانہ "الفرقان" اعلیٰ ایڈیشن تین روپے، معمولی دو روپے (محصول ڈاک بذمہ خریدار)۔

المعلن منیجر "الفرقان" بریلی (یو۔ پی)

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

تالیف ابوالاعلیٰ مودودی

حصہ اوّل

اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالت اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ، جس سے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ اِس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے۔ ذیل کے نرخوں پر آپ اسے طلب فرما سکتے ہیں

ایک روپے میں	۵ نسخے	علاوہ محصول ڈاک
نو روپے میں	۵۰ نسخے	کرایہ ریل بذمہ خریدار
پندرہ روپے میں	۱۰۰ نسخے	

حصہ دوم

اس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کر کے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے اِس وقت تک مُلک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصول اسلام اور مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔ اِس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے:۔

۲ روپے ۴ آنہ میں ۔ ۔ ۔ ۔	۵ نسخے	محصول ڈاک بذمہ خریدار
۱۱ روپے ۸ آنہ میں	۲۵ نسخے	کرایہ ریل بذمہ خریدار
۲۲ روپے میں	۵۰ نسخے	
۴۰ روپے میں	۱۰۰ نسخے	

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجیے

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینہ کے آخری ہفتہ میں شائع ہُوا کریگا۔ دوسرے مہینہ کے پہلے ہفتہ تک اگر کسی خریدار کو پرچہ نہ پہنچے تو بروقت اُن کو شکایت کرنی چاہیئے۔

رسالہ کی قیمت میں رعایت ممکن نہیں ہے۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیئے۔ جو حضرات نمبر درج نہ کریں گے۔ اُن کی شکایات پر کوئی توجہ نہ کی جائے گی۔

جن معاملات کا تعلق دفتر سے ہے اُن میں ایڈیٹر کو مخاطب نہ کیا جائے۔

مینیجر

نرخنامہ و قواعدِ اشتہار

مقدار	ایک ماہ	۳ ماہ	۶ ماہ	ایک سال
ایک صفحہ	عـہ ۱۰	عـہ ۲۵	عـہ ۴۵	عـہ ۸۰
نصف صفحہ	۶	عـہ ۱۵	عـہ ۲۵	عـہ ۴۵
ربع صفحہ	۴	عـہ ۱۰	عـہ ۱۷	عـہ ۲۵

۱۔ کوئی خلافِ شریعت یا خلافِ تہذیب و اخلاق اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

۲۔ اشتہار کی اشاعت سے پہلے اُجرت پیشگی وصُول ہونی ضرُوری ہے۔

۳۔ صِرف وہی چربے قبول کیے جائیں گے جو اس رسالہ کے مسطر کے مطابق ہوں۔

۴۔ نرخنامہ میں کوئی ترمیم نہ کی جائے گی۔

۵۔ ٹائیٹل کے صفحات پر کوئی بیرونی اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

صرف سرورق پیکن پریس نیل روڈ لاہور میں طبع ہوا